ماہنامہ مجلہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ —————— شمارہ نمبر ۶-۷

جون جولائی ۱۹۸۷ء

○ مدیر منتظم —————— نور محمد فلاحی

○ مدیر —————— طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

• سالانہ زر تعاون	۳۰ /	روپے
• خصوصی تعاون	۱۰۰ /	روپے
• اس شمارہ کی قیمت	۵ /	روپے
• غیر ممالک سے	۱۵ /	امریکی ڈالر
• فی شمارہ	۳ /	روپے

ترسیل زر کا پتہ :- دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو ۔ جامعۃ الفلاح ۔ بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

فلاح پریس [illegible] فیض آباد

نقوش حیاتِ نو

اداریہ	العلم والعلماء — میرٹھ کا فساد منصوبہ بند تھا؟	ایڈیٹر	۳
بحث و نظر	مناسک حج کی تاریخ	رضی الاسلام ندوی	۲۱
	مدرسین قرآن کی تربیت ۔	ڈاکٹر سید حسین الدین، ڈاکٹر سید منصور علی، ڈاکٹر سید فرحت علی	۱۱
مقالات	بیت المقدس کے قدیم اسلامی مدارس	محمد عارف عمر اعظمی	۶۲
	برامکہ اور ان کی طبی خدمات	حکیم عبدالباری فلاحی	۷۹
شخصیات	ترکی کے داعی کبیر علامہ سعید نورسی کی حیات پر نور	ڈاکٹر محسن عبدالحمید	۹۰
	سید جمال الدین افغانی رح	اقبال احمد سنبھلی	۴۳
عظمت کے مینار	حضرت عمیر بن وہب جمحی رض	ابوجاوید، استاد جامعہ	۷۳
تذکرۂ وطن	میرٹھ میں صوبائی کانسٹبلری کے وحشیانہ مظالم	انور سعید	۵۴
وقت کی آواز	ترکی میں کفر ٹوٹ رہا ہے	آل م	۸۹
شعر و نغمہ	غزل	شفیع اللہ خاں راز ناگاوی	۵۲
	غزل	ایم اے شمسی دربھنگہ	۵۲
	غزلیں ۔ ابوالمجاہد زاہد، ظہیر الدین ظہیر ۔	محمد شہاب الدین عمر آزاد	۲۰-۵۳
جامعہ کے لیل و نہار	جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں	۔ ادارہ ۔	۱۰۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اداریہ ــــــــــ

العلم والعلماء

"حکمت اور دانائی کی بات ایک صاحب حکمت اور دانا شخص کی گم شدہ چیز ہے پس وہ جہاں اسے پائے وہی اس کا زیادہ حقدار ہوتا ہے۔" ؎۱

"مومن کا پیٹ بھلی باتوں (علم) سے نہیں بھرتا وہ سنتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔" ؎۲

علم کے معنی جاننا، دریافت کرنا، سیکھنا اور اشیاء کی حقیقت تک پہنچنا ہے۔ علم کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے اس سے مراد وہ تمام علوم و فنون ہیں جو انسان، کائنات اور خدا کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن کی رو سے علم کا حقیقی سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ "وعلّم آدم الاسماء کلّھا" اور اس نے حضرت آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔ "علّم الانسان ما لم یعلم" اس نے انسان کو سکھایا وہ تمام چیزیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات منبع علم ہے یہاں سے جو علم ملتا ہے وہ ایک مضبوط ذریعہ سے ملتا ہے۔ "یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغمبر کا قول ہے۔ جو بڑی توانائی رکھتا ہے۔ عرش والے کے یہاں بلند مرتبہ ہے۔ وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے۔" اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے روح الامین کے ذریعہ اپنے علم کا ایک بہت ہی معمولی حصہ اپنے منتخب بندوں کے پاس بھیجتا ہے جسے نبی، رسول یا پیغمبر کہتے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے انسان اور سب سے پہلے نبی حضرت آدم ؑ کو علم سکھایا اور اپنے سب سے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن و حدیث کی شکل میں (وحی متلو اور وحی غیر متلو) علم دیا۔ یہ علم انسانوں کی فلاح و بہبود ان کی ہدایت و رہنمائی اور اس دنیا میں ان کی حیثیت اور مقام کے بارے میں ہے، اور قیامت تک کے لئے ہے۔ خدا کے آخری

؎۱ الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم فحیث وجدھا فھو احق بہا ۔ ترمذی، ابن ماجہ

؎۲ لن یشبع المومن من خیر یسمعہ حتیٰ یکون منتہاہ الجنۃ ۔ ترمذی

پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد قرآن اور حدیث ہی علم کا حقیقی سرچشمہ اور صحیح اور مبنی بر حقیقت علم ہیں بقیہ دوسرے علوم ظن و تخمین اور قیاس و گمان پر مبنی ہیں۔ قرآن انسان کی صحیح رہنمائی کرتا اور زندگی گذارنے کا سیدھا اور سچا راستہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس پوری کائنات کا ایک ہی خالق اور مالک ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ انسان اس کا بندہ ہے اور زمین میں خلیفہ اور نائب ہے وہ مختار کل ہے اور یہ محتاج کل، اس کا کام یہ ہے کہ دنیا کا نظم و ضبط اور انسانوں کے درمیان امن و قسط خدا کے قانون کے مطابق قائم کرے اور ان کے اندر خدا کے بنائے ہوئے ضابطے اور قانون ہی نافذ کرے رسول خدا اور بندوں کے درمیان انسانوں ہی میں سے منتخب کیا ہوا ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی اور پسند و ناپسند بندوں کو بتاتا ہے رسول کو تسلیم کرنا حقیقی علم کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ یہ تغیر پذیر دنیا ایک دن بالکل متغیر ہو کر ختم ہو جائے گی اور ٹوٹ پھوٹ جائیگی۔ اس کی جگہ ایک اور دنیا قائم ہوگی جہاں انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور اچھے یا برے انجام سے ہمکنار یا دوچار ہونا پڑیگا اس کو عالم آخرت کہتے ہیں۔ قرآن اس حقیقی علم کو پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا فرض قرار دیتا ہے اس کے بغیر انسانیت کی نجات ناممکن ہے حدیث میں بھی الفاظ بہت صاف اور واضح ہیں۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ۔ ابن ماجہ۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ احادیث میں اس کی بڑی فضیلت بھی آئی ہے۔ العَالِمُ وَالمُتَعَلِّمُ شَرِيكَانِ فِي الأَجْرِ۔ علم سیکھنے اور علم سکھانے والے دونوں اجر میں شریک ہیں۔ حدیث ابن ماجہ۔ مَنْ دَلَّ عَلىٰ خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ (مسلم) جو کسی اچھی بات کی طرف رہنمائی کرے۔ اسے بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس نیکی کرنے والے کو۔ "جو شخص، ایسی راہ اختیار کرے جس میں اس کو علم حاصل ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے۔ (حدیث مسلم) معلم خیر کے لئے دنیا کی ہر چیز دعائے مغفرت کرتی ہے" (ترمذی) "جو شخص علم کے حصول کے لئے (اپنے گھر) سے نکلتا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوتا ہے یہاں تک کی واپس آجائے" ترمذی۔

قرآن اس علم کے حاملین کے لئے مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے، ذی علم، علماء، اولی العلم، راسخون فی العلم وغیرہ۔ والذین اُوتوا العلم درجٰت (۱۱ مجادلہ) جن کو علم سے نوازا گیا ان کے

لئے بلند درجات ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (۴۳ عنکبوت) إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۲۸) اس کے علاوہ قرآن کی متعدد آیات میں علم اور اہل علم کا تذکرہ ہے۔ اسلام میں علم اور اہل علم کا بڑا اونچا مقام ہے۔ سید انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم بنا کر بھیجا گیا اور آپ کی بعثت کا مقصد ہی تعلیم و تزکیہ قرار پایا۔ "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۲ جمعہ) وہی ہے جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو اس کی آیات کو انھیں پڑھ کر سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے" حدیث میں کہا گیا ہے "العلماء ورثة الانبیاء" علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن اور حدیث میں جس چیز کو علم سے تعبیر کیا گیا ہے اور جن کو علماء اور راسخون فی العلم سے نوازا گیا ہے کیا وہ وہی علم ہے جو عربی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے اور کیا وہ یہی علماء ہیں جو عربی مدارس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں یا جن کے ہاتھوں میں امت کی باگ ڈور ہے؟ بادی النظر میں تو ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن جب ہم حقائق کی چھان بین کرتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے بلا شبہہ یہ دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے اور ایسے مدارس بھی پائے جاتے ہیں جہاں حقیقی علم کی تعلیم دی جاتی اور خدا کی ذات و صفات، قرآن اور حدیث تاریخ اور سیرت کو ان کے حقیقی پس منظر میں پڑھایا جاتا ہے مگر اکثر عربی مدارس جزئی اور فروعی مسائل کی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے ہیں اور وہاں قرآن و حدیث کا نام برائے نام ہی لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے اندر صحیح اسلامی فکر پائی نہیں جاتی وہ جب میدان عمل میں نکلتے ہیں تو اسلام کے علمبردار بننے کے بجائے کفر و شرک اور دہریت کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ کوئی کمیونزم کا جھنڈا بلند کر کے کمیونزم زندہ باد کہتا ہے تو کوئی سوشلزم زندہ باد کا نعرہ لگاتا ہے کوئی وحدت ادیان کا حامی ہوتا ہے تو کوئی کانگریس کے پرچم تلے دنیا اور آخرت کی نجات تلاش کرتا ہے۔ اسلام میں کتابوں کے پڑھ لینے اور ظاہری طور پر ان کو ذہن و دماغ میں اتار لینے کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ علم برائے علم کا قائل نہیں وہ عمل کو ترجیح دیتا ہے۔ قرآنی علم کے نتیجے میں جہاں انسان کے اندر بہت سی صفتیں پیدا ہوتی ہیں وہیں ایک صفت کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

اور وہ ہے خدا ترسی خشیت الٰہی اور تقویٰ۔ قرآن کہتا ہے۔ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"

مولانا امین احسن اپنی معروف تفسیر تدبر قرآن میں لکھتے ہیں "علماء یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ کی معرفت ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی درحقیقت وہ علم سے محروم ہے، اگرچہ وہ دنیا جہاں کی کتابیں حفظ کر ڈالے جس کے اندر خدا کی معرفت پیدا ہوگی اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔"

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بحر محیط کے حوالہ سے اپنی تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں "خشیۃ اللہ علماء کا وصف خاص اور لازم ہے یہ ضروری نہیں کہ غیر عالم میں خشیۃ نہ ہو۔"

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا "لیس العلم بکثرۃ الحدیث ولکن العلم عن کثرۃ الخشیۃ" یعنی بہت سی احادیث یاد کرلینا یا بہت باتیں کرنا کوئی علم نہیں ہے بلکہ علم وہ ہے جس کے ساتھ اللہ کا خوف ہو"

احمد بن صالح مصری کا قول ہے "خشیۃ اللہ کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہنچایا جاسکتا ہے بلکہ اس کو کتاب و سنت کی اتباع سے پہنچایا جاسکتا ہے۔"

حضرت ربیع بن انسؓ فرماتے ہیں "من لم یخش فلیس بعالم" اور مجاہدؒ کا قول ہے، "انما العالم من خشی اللہ" "عالم تو صرف وہی ہے جو اللہ سے ڈرے۔"

ان تشریحات کی روشنی میں اگر عربی مدارس کے فارغین اور نام نہاد علماء کہلانے والے افراد کا جائزہ لیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے ایسے علماء کو چراغ لے کر تلاش کرنا ہوگا جن کے اندر خدا کی محبت اور خشیت الٰہی کی شمع جل رہی ہو بلکہ ایسے علماء لاکھوں کی تعداد میں ملیں گے جنھوں نے کسی مدرسہ کے متعینہ نصاب کو پڑھ لیا ہوگا اور عالمیت کا تاج سر پر سجا کر گھومتے پھرتے ہیں۔ حدود اللہ کو پامال کرنے اور ایک دوسرے کی جیب و داماں کو پھاڑنے میں لگے ہوں گے، کتنی افسوس ناک حقیقت ہے جو انبیاء کے وارث تھے اور جن کو نبی کے بعد ان کے مشن کو لے کر چلنا تھا وہ بڑی دیدہ دلیری سے امت کا شیرازہ پارہ پارہ کر رہے ہیں اور زخموں سے چور امت کو زخم پر زخم لگاتے جارہے ہیں۔

ہندوستان کے حالات اب ایسے نہیں رہے کہ ہر عالم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد تعمیر کرتا پھرے بلکہ یہاں کے حالات اب اس نقطہ پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے ہوا کے رخ کو اور تاریخ کے دھارے کو باآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میرٹھ میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ملیانہ

میں پی اے سی کا ایکشن اور قتل عام کے بعد آخر وہ کون سی قیامت کی گھڑی ہوگی جب ہمارے علماء اور دانشوروں کو ہوش آئیگا اور وہ اپنے تمام اختلافات بھلا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں گے اور ملت اسلامیہ ہند کی باعزت زندگی کی کوئی راہ تلاش کریں گے۔ اے کاش اللہ تعالےٰ ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹا دیتا۔۔۔!

میرٹھ کا فساد منصوبہ بند تھا

۱۸ سے ۲۳ مئی تک میرٹھ میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی اس کی نظیر کہیں اور ملنی مشکل ہے ہندوستانی فسادات کی تاریخ کا یہ ایک سیاہ ترین باب ہے جس کی سیاہی رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔ یہ انسانی درندگی اور بہیمیت کی ایک ایسی کہانی ہے جس کو سننے کی تاب خود درندوں کے اندر بھی نہیں ہے۔ آج میرٹھ ٹوٹی ہوئی دکانوں، جلے ہوئے مکانوں اور جھلسی ہوئی لاشوں کا شہر بن گیا ہے، ہر گلی اور ہر کوچے میں خون کے چھینٹے زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکاریگا آستین کا

اس خونی سرگذشت کا سب سے گھناؤنا اور قابل نفرت و مذمت وہ کردار ہے جو پی اے سی کے درندوں نے ملیانہ میں ادا کیا۔ ۲۳ مئی کی دوپہر کے تین گھنٹوں تک پی اے سی اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتی رہی اس نے مسلمانوں کے گھروں کو چن چن کر لوٹا، جلایا اور تباہ و برباد کیا اور مسلمان نوجوانوں کو ٹرکوں میں بھر کر لے گئی اور سیکڑوں مسلمان نوجوانوں کو گولیوں سے بھون کر گنگ نہر اور ہنڈن نہر میں پھینک دیا، آج ملیانہ گاؤں ایک قبرستان کا منظر پیش کرتا ہے، اور لوہا گاؤں پی اے سی کی درندگی کی شہادت دے رہا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ پی اے سی کو نہتے اور بے قصور مسلمانوں کا خون پسند ہے اور وہ ابتک اسی پر چل رہی ہے، ملک کا سیاسی ڈھانچہ بھی ایسا کرنے میں پی اے سی کا تعاون کرتا ہے پی اے سی کا ابتک کا کردار ایک انتہائی متعصب فرقہ پرست اور جانبدار فورس کا رہا ہے جہاں فساد کو بھڑکانا ہوتا ہے، اور مسلمانوں کو سبق سکھانا ہوتا ہے، وہاں حکام پی اے سی کو بھیجتے ہیں اور وہ بلا کسی

پس و پیش کے ایک فرقہ کو کھلی آزادی اور تحفظ فراہم کرتی ہے، اور دوسرے فرقہ کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتی ہے۔ اس نے اکتوبر و نومبر ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ کے فساد میں ۲ نوجوانوں کو سفاکانہ طور پر گولی مار کر ہلاک کر دیا، اور مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا اور جلایا۔ ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کو مراد آباد میں عین عید کے موقع پر نماز کی حالت میں پی اے سی نے مسلمانوں پر گولیاں چلائیں، اور سیکڑوں مسلمان شہید ہوئے۔ شرارت بھی پی اے سی ہی کے کسی نوجوان نے عیدگاہ کی طرف سور ہانک کر کیا تھا۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۲ء میں میرٹھ ہی میں پی اے سی نے تباہی مچائی تھی، اور درجنوں مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ گذشتہ سال بنارس اور مئو میں پی اے سی کے درندے لوٹنے، جلانے اور انسانوں کو قتل کرنے میں پیش پیش رہے۔ اور اب ملیانہ انسانی تاریخ کا جو بدترین حادثہ ہے جسے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کی محبوب ترین فورس پی اے سی کے ظالم، خونخوار اور درندہ صفت نوجوانوں نے انجام دیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کوشک، اور چیف منسٹر ویر بہادر سنگھ اس کو روزمرہ کا ایک معمولی واقعہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فساد منصوبہ بند تھا۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس اضافہ کے ساتھ کہ یہ منصوبہ خود وزیر اعلیٰ کا تھا اور یہ راجیو گاندھی کی خوشنودی کے لئے تھا۔ فسادات کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ کسی بات سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے کانگریسی لیڈروں نے ہمیشہ فساد کا سہارا لیا ہے اور ایسے علاقوں کو چنا گیا ہے جہاں مسلمان قابل لحاظ حد تک موجود ہوں۔ احمد آباد کی تاریخ ہم کو یہی سبق دیتی ہے اور اب میرٹھ کا واقعہ اس سے مختلف نہیں ہے۔ ۳۰ مارچ کو بوٹ کلب پر لاکھوں مسلمانوں کے پرامن مظاہرے سے سب سے زیادہ جس شخص کو تکلیف ہو سکتی تھی وہ چیف منسٹر کی ذات تھی کیونکہ اس کے روکنے اور ہزاروں جتن کے باوجود مظاہرہ کامیاب ہوا تھا۔ انتقام کی آگ اس کے سینے میں کھول رہی تھی۔ سویڈن نے بوفورس کمپنی سے توپوں کے سودے میں چار کروڑ ڈالر کے کمیشن سے کانگریس کی رسوائی، امریکی جاسوسی ادارہ فیرفکس کے ذریعہ سوئیٹزرلینڈ کے بینکوں میں ہندوستانی سرمایہ داروں کے اکاؤنٹس کی جانچ سے پیدا شدہ مسائل میں کانگریس آئی کا الجھنا اور میڈیا کا روزانہ کانگریس کے متعلق کوئی نہ کوئی اہم انکشاف نے راجیو گاندھی اور ان کے ٹولے کو بوکھلا دیا اور انہوں نے رائے عامہ کو اس رخ سے ہٹانے

کیلئے میرٹھ اور ملیانہ کا پلان بنایا ورنہ وزیر اعلیٰ کے اس اعلان کا کیا مطلب ہے جو انہوں نے دلی میں تحقیقات سے پہلے ہی کیا "اس قتل میں پی اے سی کا ہاتھ نہیں ہے"۔ فسادات کے دوران چیف منسٹر نے میرٹھ کا دورہ کیا اور کئی روز تک وہاں ٹھہرے رہے مگر فساد برابر بڑھتا رہا۔ ضلع مجسٹریٹ مسٹر کوشک بھی چاق و چوبند رہے مگر فسادات میں کمی نہیں آئی لیکن ملیانہ کے واقعہ کے بعد حالات سدھرنے لگے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ کو کسی ایسے مقام پر لے جانے کا منصوبہ تھا جہاں سے مہینوں تک میڈیا کی واپسی ناممکن ہو اور یہ پی اے سی وزیر اعلیٰ کی محبوب فورس ہی کر سکتی تھی۔ نہتے اور معصوم مسلم نوجوانوں کو قربانی کا بکرہ بنا کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ ہنڈن ندی اور گنگ نہر کی سیکڑوں لاشیں وزیر اعلیٰ کی منصوبہ بندی کی گواہی پیش کرتی ہیں اور انتظامیہ اور پی اے سی کے متعلق راجیو کے تعریفی کلمات "نرم دستانوں میں زہریلے خنجر" کا پتہ دیتے ہیں۔ مسٹر کلین اب کلین نہیں رہے بلکہ اب وہ مسٹر ڈرٹی ہو گئے ہیں اور ان کا بظاہر سفید لباس میرٹھ اور ملیانہ کے معصوم مسلم نوجوانوں کے خون سے داغدار ہو گیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ معصوم خون رایگاں نہیں جاتا اور مظلوموں اور بے کسوں کی آہیں بے اثر نہیں ہوتیں۔ اگر پی اے سی کو توڑا نہیں گیا تو یقیناً اس کے خونی ہاتھ انسانیت کا گلا دباتے رہیں گے اور انسانیت و شرافت چیختی رہے گی۔

میرٹھ کے فسادات کے چند غور طلب پہلو :-

۱۔ حالات اور واقعات بتاتے ہیں کہ یہ فساد منصوبہ بند تھا۔

۲۔ مسلمانوں کو جان بوجھ کر اشتعال دلایا گیا

۳۔ ایک فرقہ کو پولس، پی اے سی اور انتظامیہ کی کھلی مدد حاصل تھی اور کرفیو کے باوجود وہ آزاد تھے اور ادھر ادھر آ جا سکتے تھے مظاہرے کر سکتے تھے اور پی اے سی کی حمایت میں جلوس نکال سکتے تھے۔

۴۔ پولس اور پی اے سی نے چن چن کر مسلمانوں کو لوٹا، ان کے گھروں کو جلایا اور قتل کیا، خصوصاً ملیانہ میں تو پی اے سی نے شدید ترین درندگی کا مظاہرہ کیا اور سیکڑوں مسلمان نوجوانوں کو ٹرکوں پر لاد کر گولیوں سے اڑایا اور ان کی لاشوں کو گنگ نہر اور ہنڈن ندی میں پھینک دیا جس میں سے ۳۰ لاشیں اور بعض زندہ مگر زخمی انسان برآمد کئے جا چکے ہیں۔

۵۔ انتظامیہ نے حقائق کو چھپانے کی کوشش کی اور ایک طرفہ جھوٹ بول کر مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی
۶۔ چند اخبارات و رسائل کو چھوڑ کر باقی پورے قومی پریس نے حقائق کے خلاف خبریں اور مضامین شائع کیے اور مسلمانوں کو بدنام کیا۔
۷۔ ضلع انتظامیہ، وزیر اعلیٰ، وزیر اعظم سب کی ہمدردیاں ظالموں کے ساتھ ہیں، چند نے بلاواسطہ اور چند نے بالواسطہ پی اے سی کی بےگناہی ثابت کرنے کی کوشش کی اور کرتے جا رہے ہیں

مسلمانوں کے لیے چند غور طلب پہلو: ہندوستان میں عملاً دو ہی طبقے رہتے ہیں ایک ہندو اور دوسرا مسلمان۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو قومی دھارے میں لانا چاہتا ہے اور اس کے لئے ہر طرح کا حربہ استعمال کر رہا ہے اور دوسرا اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہتا ہے، یہ کشمکش تقریباً نصف صدی سے جاری ہے اور آئندہ اسکے ختم ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے بلکہ شدت آسکتی ہے ایسی صورت میں کسی مضبوط سہارے کے بغیر زندگی آسان نہ ہوگی اور یہ مضبوط سہارا خدا کی ذات ہے اس سے تعلقات کو تمام مسلمان مضبوط بنائیں خدا سے تعلق جتنا مضبوط ہوگا زندگی اتنی ہی آسان ہوگی۔

۲۔ فسادات تمام پارٹیوں کی ضرورت بن گئے ہیں، خصوصاً کانگریس آئی کی اور اب علانیہ بی جے پی اور کانگریس میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے اس کو ختم کرنا ممکن نہیں البتہ عقل و ہوش سے کم ضرور ہو سکتے ہیں اس لئے ہم ہوش و عقل کی زندگی بسر کریں، اور اشتعال میں نہ آئیں۔

۳۔ مسلمانوں کی لاشوں پر لیڈری چمکانے والے مسلم لیڈروں کو ٹھوکریں مار کر الگ کریں اور ہوش مند، بے غرض، دوراندیش اور ملت کی خدمت کرنے والے مسلم لیڈروں کے ہاتھ مضبوط کریں۔

۴۔ ملت فروش، گروہ بندیوں میں تقسیم کرنے والے اور اختلافی مسائل کو ہوا دینے والے نام نہاد علماء کا کان پکڑیں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں لائیں جس میں محبت، اخوت، و بھائی چارگی موجود ہو۔

۵۔ ہمیں جو بھی وقت اور زندگی کے وسائل میسر ہیں اس میں ملی فریضہ سے غافل نہ ہوں، اور باشندگان ملک کو نامساعد حالات کے باوجود خدا کا پیغام بتانا نہ بھولیں، خدا کے پیغام کو باشندگان ملک تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے

آخر میں ہم مسلم لیڈروں اور علماء سے ایک بات کہنا چاہیں گے اور وہ یہ ہے کہ ہر واقعہ اور حادثہ کو اپنی لیڈری کیلئے استعمال کرنے کے بجائے خدارا ایک جگہ بیٹھ کر مسلمانوں کیلئے ہندوستان میں باعزت اور محفوظ زندگی کی راہ تلاش کریں ورنہ بعید نہیں جب قوم کے نوجوان آپ کا حساب چکانا شروع کر دیں۔ خدا ہمیں اپنی نصرتوں سے نوازے اور ظالم و جابر قوم سے محفوظ و مامون رکھے۔ ●

طارق فارقلیط فلاحی
۲۹/۶/۸۷

مدرسین قرآن کی تربیت

تحریر
ڈاکٹر سید حسین الدین احمد — جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ
ڈاکٹر سید فرحت علی برنی — جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ
ڈاکٹر سید منصور علی — انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

ابتدائی کلام

ہمارے لیے رشد و ہدایت اور علم کا منبع قرآن و سنت ہے۔ اس میں جتنا زیادہ فہم و ادراک پیدا ہوگا اتنا ہی زیادہ عمل کی راہیں کھلیں گی اور اسی نسبت سے مسلمانوں کو فوز و فلاح نصیب ہوگا۔ دراصل مسلمانوں کی زندگی ایک ایسے محور کے گرد چکر لگاتی ہے جس کا ایک سرا مسجد سے ملتا ہے اور دوسرا سرا قرآن تک پہنچتا ہے۔ انہی دونوں سروں کی مضبوطی سے مسلم امت کی تقدیر وابستہ ہے جتنا زیادہ تعلق مسلمانوں کا مسجد اور قرآن سے ہوگا اسی نسبت سے ان میں للّٰہیت پائی جائے گی۔ اور اسی مناسبت سے ان کے اخلاق، کردار اور سیرت میں رفعت کا عنصر ہوگا اور اسی قدر ان کے عہد و پیمان اور معاملات میں کھرا پن پایا جائے گا، اور عملی نفاق سے دور ہوں گے۔

مسجد میں دل کا اٹکا رہنا حشر میں عرش کے سایہ کی ضمانت ہے اور قرآن سے شغف شفاعت اور نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ دونوں باتیں اتنی معروف ہیں کہ کسی کلام اور بیان کی حاجت نہیں۔ اس کے باوجود صورتحال یہ ہے کہ ہم نماز سے بیگانہ ہیں اور قرآن گھروں میں موجود تو ہے مگر اس پر جمی ہوئی گرد و غبار اسی وقت صاف ہوتی ہے جب کسی کے سرہانے یاسین پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے، یا پھر کسی کا سوم ہوتا ہے یا چالیسواں، ہاں کچھ لوگ ایسے بھی مل جاتے ہیں جو نئے گھر میں جانے سے پہلے محفل قرآن خوانی کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ سلوک جو آجکل کے معاشرہ میں قرآن سے روا رکھا جا رہا ہے۔

جہاں تک ان دینی درسگاہوں کا تعلق ہے جو اس وقت ملک میں قائم ہیں تو ایک طرف تو ان کی تعداد بہت کم ہے نتیجتاً بہت کم لوگ ان سے فیض یاب ہو پاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا معیار بھی بہت اچھا نہیں ہے جس کی وجہ سے شہری آبادی میں رہنے والے لوگ اپنے بچوں کو وہاں نہیں بھیجتے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ جو چیز غیر محسوس طریقہ پر اثر ہو رہی ہے وہ ان دینی درسگاہوں کے اساتذہ کرام کی عظیم اکثریت میں علم و تقویٰ کے اس حسین امتزاج کا فقدان ہے جو ان کے منصب کا

حق ہے اور یہ عمل ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹے جا رہا ہے۔ انحطاط کے اس سیلاب پر بند کا کام قرآن کی تعلیمات ہی کر سکتی ہیں اور اس کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو عقیدۃً پختہ ہوں اور سیرت و کردار کے لحاظ سے اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے (یعنی عمل اور علم والے)۔

دین کی تبلیغ میں حلقہ قرآن، تلاوت آیات ترجمہ، آسان الفاظ میں ان کی تشریح اور متعلق سوالات کے جوابات بہت آسان ثابت ہوئے ہیں اور جہاں جہاں اس قسم کے حلقے بلا ناغہ کام کر رہے ہیں اس کے خوشگوار اثرات سامنے آئے ہیں۔ ان قرآنی حلقوں کے چلانے اور انہیں موثر بنانے میں جہاں عوام الناس کی غفلت رکاوٹ بنتی ہے وہیں مناسب مدرس کا دستیاب نہ ہونا بھی مانع بنتا رہا ہے۔ مناسب مدرس سے میری مراد قرآن و سنت کا علم رکھنے والے وہ اصحاب ہیں جو سامعین کی تعداد سے بے نیاز ہو کر فقط اپنے فرائض کی ادائیگی اور اللہ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کی خاطر درس قرآن پیش کریں۔ کام اخلاص سے کیا جائے اور تمام لوازم کو پیش نظر رکھا جائے تو کوئی وجہ ایسی نہیں ہے کہ وقت کے ساتھ سامعین کی تعداد میں اضافہ نہ ہو لیکن ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ایسے مدرسین بہت ہی کم تعداد میں ملتے ہیں نتیجتاً آغاز حلقہ کے کچھ دنوں کے بعد یہ سلسلہ بند ہو جاتا ہے ان چیزوں سے بچنے کی ایک سبیل تو یہ ہو سکتی ہے کہ صرف انہیں جگہوں پر درس قرآن کے پروگرام کا آغاز کیا جائے جہاں اچھے اور مناسب مدرس میسر ہوں لیکن اس بات کا امکان موجود ہو کہ کچھ تعلیم و تربیت کے ذریعہ چند لوگوں کو اس قابل بنایا جا سکتا ہو کہ وہ درس قرآن پیش کرنے لگیں تو ایسے مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا کفران نعمت کے مترادف ہوگا۔ زیر نظر مضمون میں ان تجربات کو پیش کیا جا رہا ہے جو مدرسین قرآن کی تربیت کے دوران حاصل ہوئے یہ تجربہ گذشتہ تین سال سے جدہ میں کیا جا رہا ہے اور اسی نہج پر اسلام آباد میں بھی اس کام کا آغاز ہوا ہے۔ اس کام کے اثرات دعوتی کاموں پر قابل اطمینان رہے ہیں۔

طریقہ کار

اس پوری تربیت میں عملی لحاظ سے درس قرآن تمام شرکاء سے

پیش کروایا جاتا ہے اور پھر صاحب علم و فن کی طرف سے اس بات کا جائزہ سامنے آتا ہے کہ پیش کردہ درس کے اچھے پہلو کون کون سے تھے اور کون کون سی باتیں تشنہ رہ گئیں۔ اس طرح مدرسین کے علم میں یہ بات آجاتی ہے کہ آئندہ کی تیاری میں کن کن باتوں کو اپنانے کی کوشش ہونی چاہئے اور کن کن باتوں سے بچنا ہے۔ اسی مشق کو بار بار کروا کر اس قابل بنایا جاتا ہے کہ کسی بھی دینی مجلس میں قرآن کا درس پیش کرنا آسان ہو جائے۔

مدرسین کا انتخاب

مدرسین کے انتخاب میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ انہی لوگوں کو موقع دیا جائے جو قرآن کا ذوق رکھتے ہیں اور ایک زمانے سے قرآن کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور وضع و قطع کے اعتبار سے متدین ہوں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی وجہ سے انہیں کسی مجلس میں دین کے حوالے سے گفتگو کا موقع نہ مل سکا ہو۔

مدرسین کی تعداد اور ہر ماہ ہونے والے اس پروگرام کی تعداد اور اس کے وقفہ کے متعلق کئی پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تجربہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایک سال کی تربیت گاہ کے لئے دس مدرسین کا انتخاب کیا جائے اور انہیں دو گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ہر گروپ میں ۵ افراد ہوں گے۔ پروگراموں کی تعداد کا اس طرح تعین ہو کہ ہر ماہ کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو درس پیش کرنے کا موقع ہر زیر تربیت فرد کو مل جائے۔ شروع میں ایک درس فی ماہ ہو تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح مدرس کو تیاری کے لئے اچھا خاصہ وقت مل جائے گا۔

ایک نشست میں ایک گروپ کے تمام افراد سے درس دلایا جائے اس طرح کہ ہر ایک کو ۲۰–۲۵ منٹ درس پیش کرنے کے لئے دیا جائے اور چند منٹ پہلے سے متعین حکم کو تبصرے کے لئے مل جائیں یوں ایک زیر تربیت فرد کے لئے آدھ گھنٹہ درکار ہوگا۔ لہٰذا ۵ افراد کے لئے ڈھائی گھنٹے چاہئے ہوں گے۔ آدھ گھنٹہ کا بیچ میں وقفہ برائے نماز اور چائے ہو جائے تو پھر تین گھنٹے میں پروگرام مکمل ہو جانا چاہئے اس طرح سے دوسرے گروپ کے لئے بھی تین گھنٹے درکار ہوں گے۔

ایک ہی دن میں دونوں گروپوں کے لئے پروگرام رکھنا سود مند ہوگا لہٰذا دو مختلف دنوں میں رکھا جائے۔ ویسے اس بات کا التزام ضرور ہو کہ ہر پروگرام میں ہر زیر تربیت فرد کی شرکت ضروری ہو۔ ان شرکاء کے علاوہ کچھ اور لوگ جو شرکت کے خواہاں ہوں تو انہیں اجازت دی جا سکتی ہے۔

حکم کا انتخاب

اس قسم کی تربیت گاہ کی روح اس بات میں مضمر ہے کہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے جو کسی بھی شخص میں موجود ہیں۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس قسم کی تربیت میں نفسیاتی لحاظ سے نزاکت کا عنصر شامل ہونا شروع ہو جاتا ہے اس لئے حکم، جس کے ذمہ پیش کردہ درس کے اچھے اور برے پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے، کی ذمہ داری بہت اہمیت کی متحمل ہے اسے تربیت اور حکمت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا تاکہ کوئی بھی بات رہ نہ جائے اور ساتھ ہی اس انداز میں کہی جائے کہ درس پیش کرنے والا یہ محسوس کرے کہ ساری باتیں اس کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کہی جا رہی ہیں۔

حکم کے انتخاب میں اس بات کا اہتمام ہونا چاہئے کہ ان کی نظر قرآن اور سنت پر بھرپور ہو اور خود درس پیش کرنے کا تجربہ رکھتے ہوں حکم کی تعداد تین ہو تو بہتر ہے تاکہ ذاتیات کا پہلو شامل ہو بھی جائے تو اسے نکالنا آسان ہو جائے۔ حتمی درجہ بندی میں تینوں کا اوسط لیا جانا چاہئے۔

آیات کا انتخاب

درس کے لئے دو ہی طریقے قابل عمل ہیں یا تو موضوع کا انتخاب ہو جائے اور اس کے لحاظ سے جہاں بھی آیتیں آئی ہیں ان کے حوالے سے گفتگو ہو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چند مسلسل آیتوں کا درس پیش کیا جائے یعنی ان آیتوں میں جو جو مضامین آئے ہیں ان کے متعلق بیان ہو۔ اول الذکر مبتدی کے لئے مشکل ہے اس لئے آیتوں کا انتخاب مناسب معلوم ہوتا ہے

مضامین کے اعتبار سے قرآن کی تمام آیات کو چار بڑے مضامین میں منقسم کیا جاتا ہے:

۱۔ عقائد ۲۔ احکام ۳۔ قصص اور امثال

یوں تو قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ بہت اہم اور ہدایت کا سرچشمہ ہے لیکن درس کو دعوتی رنگ دینے کے لئے عقائد پر زیادہ زور دیا جائے اور دوسری آیتیں عقائد کو تقویت پہنچانے کے لئے پیش کی جائیں تو شاید درس زیادہ موثر ثابت ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ انتخاب آیات میں مدرس کے معیار کو بھی سامنے رکھا جائے اور مدرس کو اس بات کی آزادی ہونی چاہئے کہ منتخب شدہ آیات میں سے جتنے حصہ پر متعین وقت میں مربوط، مدلل اور موثر گفتگو ہو سکے اتنے ہی حصہ کو پیش کرے۔

اب وہ آیات، رکوع یا سورتیں پیش کی جاتی ہیں جو مدرسین کی تربیت کے لئے منتخب کی جا سکتی ہیں:۔

سورۃ الفاتحہ ، البقرہ رکوع ۱، ۳، ۴، ۱۰، ۱۷، ۲۰، ۳۳، ۳۷، ۳۸،
۴۰ اور سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۷۔

آل عمران: رکوع ۱، ۳، ۴، ۱۱، ۱۵ اور ۲۰۔

النساء: آیت ۳۶، ۳۷، ۵۸، ۵۹، ۶۴، ۷۰ اور النساء رکوع ۱۵۔

المائدہ: رکوع ۲، آیت ۳۵—۴۰ رکوع ۸، ۱۰۔

الانعام: رکوع ۲، ۳، ۶، ۷، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۹ اور آیت ۱۶۲، ۱۶۵

الاعراف: رکوع ۳، ۴، ۷، ۲۲

الانفال: آیت ۱-۴، رکوع ۲، ۳، ۴، ۹

التوبۃ: آیت ۱۶-۱۹، آیت ۱۹—۲۲، آیت ۳۰—۳۲، رکوع ۶، ۸، ۹،
آیت ۱۱۱، آیت ۱۱۲، آیت ۱۱۷، ۱۱۸، رکوع ۱۵، آیت ۱۲۳—۱۲۷، آیت ۱۲۸—۱۲۹،

یونس: رکوع ۴، ہود: آیت ۱-۵، آیت ۶-۸، رکوع ۳، ۴، ۵، ۸

یوسف: رکوع ۱، ۵، ۱۲ الرعد: رکوع ۲، ۳

ابراہیم: رکوع ۱، ۲، ۴، ۵ الحجر: رکوع ۴، ۶

النحل: رکوع ۱، ۲، ۳، ۵، ۹، ۱۰، ۱۱، آیت ۹۰، رکوع ۱۶،

الاسراء: رکوع ۱، ۳، ۴، ۶، ۹، ۱۰

الکہف : رکوع ۱، ۲، ۳، ۶، ۱۲	طٰہٰ : آیت ۱ تا ۸، رکوع ۸،
الانبیاء : رکوع ۱، ۲، ۳، ۵، ۴	الحج : رکوع ۱۰
المومنون : آیت ۱-۱۱، رکوع ۵،	النور : رکوع ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷
الفرقان : رکوع ۶	الشعراء : رکوع ۵،
النحل : آیت ۱-۶	القصص : رکوع ۶، ۷، ۸
العنکبوت : رکوع ۵، ۶، ۷	الروم : رکوع ۱، ۲، ۳، ۴، ۶
لقمٰن : رکوع ۱، ۲	السجدۃ : ۱، ۲
یٰسین : رکوع ۲، ۴	ص : رکوع ۱، ۳، ۵
الزمر : رکوع ۲، ۳، ۴، ۶، ۸	المومن : رکوع ۱، ۵، ۶، ۷

الشوریٰ : ۲، ۳، الجاثیۃ : رکوع ۱، ۲، الفتح : رکوع ۱، ۲، ۳، ۴

الحجرات : رکوع ۱، ۲ ق : رکوع ۱، ۲ الذریت : رکوع ۱، ۲

النجم : رکوع ۱، ۲ الرحمٰن : رکوع ۱، ۲ الواقعہ : رکوع ۱، ۲

الحشر : رکوع ۱، ۲ الصف : رکوع ۱، ۲ الجمعۃ : رکوع ۱، ۲

التحریم : رکوع ۱، ۲ الملک : رکوع ۱، ۲ المزمل : رکوع ۱، ۲

المدثر : رکوع ۱، ۲ الدھر : رکوع ۱، ۲ النباء : رکوع ۱، ۲

النزعت : رکوع ۱، ۲ التکویر، الانفطار، الانشقاق، الاعلیٰ، الغاشیہ، الضحیٰ، العلق، القدر، الزلزال، التکاثر، العصر، الھمزہ، الماعون، الکافرون، اخلاص، الفلق اور الناس۔

مندرجہ بالا آیات کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ توحید، آخرت اور رسالت کا مضمون بار بار سامنے آتا رہے، بعض فروری احکامات بھی سامنے آجائینگے، اختتام کے قریب مدرسین کو موضوعات دیئے جاسکتے ہیں تاکہ انکی بھی مشق ہوجائے۔

تربیت کی مدت

اس سلسلے میں اصولی بات تو یہ ہے کہ ایک سال کی مدت میں ہر شریک مدرس کو کم سے کم اتنا موقع مل جائے کہ

اجنبی کے سامنے بھی قرآن اور حدیث کے حوالے سے تھوڑی دیر کے لئے پورے وثوق کے ساتھ گفتگو کر سکے۔ یقیناً ہر ایک کے لئے ایک ہی مدت کی ضرورت نہیں ہوگی لیکن جو بات تجربہ سے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ کم سے کم چھ دروس حلقہ کے سامنے پیش ہوں اور اتنے ہی نظم کے اجتماعات میں تاکہ بعد میں مشق ہوجائے۔

ہر مدرس کے لئے ماہانہ ایک درس اور اسی درس کو کسی نظم کے اجتماع میں دہرانے کا پروگرام اس طرح سے بن سکتا ہے کہ ایک سال کی مدت میں آٹھ سے دس مدرسین قرآن اس دینی فریضہ کو انجام دینے کے قابل ہوجائیں۔

جائزے کے نکات

جائزے کے نکات کو ایک ٹیبل کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے جو بہت ہی واضح ہے۔

نمبر	نکات	کل نمبر
۱۔	قرأت	۱۰
۲۔	ابتدائی اور آخری کلمات	۵
۳۔	بولنے کا انداز	۱۰
۴۔	موضوعات کے لحاظ سے وقت کی مناسب تقسیم	۱۵
۵۔	قرآن وحدیث کے حوالے	۲۰
۶۔	دیگر کتب کے حوالے	۵
۷۔	ہاتھوں اور آنکھوں کا مناسب استعمال	۱۰
۹۔	زبان پر عبور	۱۰
۱۰۔	وقت کی پابندی	۱۰
۱۰۔	ملاحظات	۵

حاصل شدہ نمبر ۱۰۰

ہر مدرس کو یہ نکات پہلے ہی سے بتا دیئے جائیں تاکہ اسی کے مطابق تیاری کرے

اور حلقہ کو بھی یہ باتیں پہلے ہی سے معلوم ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر مدرس کے ہر درس کا ریکارڈ رکھا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ توجہ طلب باتوں کے علم میں آجانے کے بعد اصلاح ہوئی یا نہیں یہ بات کہیں یہ نہیں کہ جو اصلاح سے مسلسل اعراض کریں قرآن کا درس پیش کرنے کی ذمہ داری ان کے سپرد نہ کی جائے۔

نتیجہ کا مرتب کرنا ہر حلقہ کی طرف سے دیئے گئے نمبر کا اوسط لیا جائے اور پھر پورے سال کے نمبروں کا بھی اوسط لیا جائے اس کے بعد ناظم تربیت یا امیر حلقہ یا زون اور تمام حلقہ حضرات ہر ایک مدرس کے متعلق انفرادی طور پر فیصلہ کریں کہ درس دینے کی ذمہ داری ان کے سپرد ہونی چاہئے یا نہیں۔

دروس کی تیاری اور اس کی ادائیگی کے لئے چند ارشادات

تیاری:- مواد کی فراہمی: با ترجمہ قرآن (شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا ترجمہ لفظی ترجمہ کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے) تفاسیر (تفہیم القرآن، تدبر القرآن، معارف القرآن، ترجمان القرآن، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری) سے اردو زبان میں مدد لی جا سکتی ہے جبکہ عربی میں فی ظلال القرآن، روح المعانی، تفسیر الکبیر، الجامع الاحکام القرآن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے) احادیث کی کتب (مشکوٰۃ ایک جامع کتاب ہے) نفس موضوع اور مضمون سے متعلق کتب و مضامین، اور کیسٹ پہ دروس و تقاریر ممکن ہو سکے تو مفردات القرآن از راغب اصفہانی، عربی لغت، کاغذ، قلم، کیسٹ اور کیسٹ ریکارڈر۔ اچھے معلم حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اچھی تیاری کے بغیر اچھا لیکچر نہیں دیا جا سکتا اور بالعموم ایک گھنٹے لیکچر کے لئے کم سے کم دس گھنٹے کی تیاری درکار ہوتی ہے اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ مدرسین کو کم از کم ہفتہ وار (روزانہ تقریباً ۲ گھنٹے) تیاری میں لگانا چاہئے مطالعہ، نوٹ لینا، مشق کی خاطر تقریر کرنا، ترمیم و اضافہ کرنا یہ وہ کام ہیں جن کیلئے وہ وقت درکار ہے۔

درس کی تیاری:- قرآن کی ان آیات کی تلاوت کئی بار کی جائے جن کا درس دینا ہے یہاں تک کہ صحیح تلفظ کے ساتھ ان کی ادائیگی ہو سکے، ترجمہ بھی ایک سے زائد مرتبہ دیکھ

لیا جائے، ان آیات میں اہم مضامین کا تعین کر لیا جائے پھر اہم الفاظ کو تلاش کیا جائے پھر اہم الفاظ کو تلاش کیا جائے ان کی ترکیب کو سمجھا جائے اور معنی نوٹ کئے جائیں اس میں مفردات القرآن سے مدد لی جا سکتی ہے، نفس سے تفصیل سمجھی جائے اور مختلف تفاسیر کا مطالعہ کیا جائے اور ساتھ ساتھ نوٹ کرنا نہ بھولا جائے۔

نفس مضمون، موضوع، سبق، واقعات اور فلسفہ پر قرآن احادیث اور دیگر متعلقہ کتب سے مفید حوالے، تفصیل، تبصرہ اور اشعار تلاش کئے جائیں اور انہیں مناسب مقامات پر لکھ لیا جائے۔

کیسٹ ریکارڈر کو استعمال کر کے درج بالا انداز میں جو مواد تیار ہوا ہو اس پر آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ تقریر ہو اور وقت نوٹ کیا جائے۔ اس تقریر کو سنا جائے جہاں جھول ہو آواز آہستہ ہو، بات غیر دلچسپ ہو، جوش بیان زیادہ ہو، حد سے بڑھا ہوا ہو وقت زیادہ ہو تو پھر تمام کمزور پہلوؤں کی نشاندہی ہو اور ان سب کی ایڈیٹنگ ہو اور ایڈیٹ شدہ مواد کو دہرایا جائے اس کے بعد بھی بعض باتیں غیر مناسب معلوم ہوں تو نئے سرے سے آغاز کر کے اصلاح کی جائے۔

ابتداء میں ممکن ہے کہ وقت زیادہ لگے لیکن یہ طریقہ کار اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ جو مواد اس طرح تیار ہو گا انشاء اللہ مؤثر ہو گا اور دلچسپی کا ذریعہ بنے گا۔

درس کی ادائیگی:- سامعین کے سامنے پہلے تلاوت ہو پھر ترجمہ پیش کیا جائے آغاز میں مختصر پس منظر بیان ہو پھر نفس مضمون اور موضوعات پر گفتگو ہو، ایک ایک آیت یا لفظ یا موضوع کو لے کر تقریر ہو، تقریر اور وضاحت میں وقت زیادہ لینا ہو تو آیت یا لفظ کو دہراتے رہنا چاہئے، سامعین کی صلاحیت دلچسپی اور معیار کو سامنے رکھ کر گفتگو ہو، زبان سادہ اور آسان اور آواز بلند اور واضح ہو آخر میں تقریر کا خلاصہ رکھا جائے۔

احتیاط: تفاصیل اور وضاحتوں میں اپنی طرف سے یا اپنی عقل سے کچھ بھی نہ کہا جائے جو کچھ تفاسیر میں موجود ہے انہیں کی وضاحت ہو اور حوالہ دیا جائے نزاعی اور اختلافی مسائل کو ہرگز ہرگز نہ چھیڑا جائے، کوئی مسئلہ نہ آتا ہو تو بلا تردد اس کا اعتراف کر لیا جائے۔

مدرسین کے لئے ہدیہ

تربیت کی پوری مدت میں یوں تو مدرسین نے بہت محنت کی ہوگی جس کا سب سے زیادہ فائدہ انہی کو پہنچا ہوگا لیکن ان تمام کاوشوں کے نتیجہ میں وہ اس قابل ہوئے کہ اس نورِ ہدایت کے پیغام کو دوسروں تک پہنچا سکیں۔ اس کام میں ان کے لئے بہت آسانی پیدا ہو جائے گی، اگر المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم از محمد فواد عبدالباقی یا المفردات القرآن از راغب اصفہانی کا ایک ایک نسخہ ہر مدرس قرآن کے پاس موجود ہو۔ یہ سعادت اس علاقہ کی تنظیم کو حاصل ہو کہ وہ ہدیۃً اسے ہر مدرس کو پیش کرے تاکہ تاقیامت جاری رہنے والے اجر و ثواب میں سے کچھ نہ کچھ حصہ اس علاقہ کے ہر ساتھی کے حصہ میں آئے۔

کلام آخر

قرآن کی دعوت کچھ جگہوں پر اس لئے پیش نہیں ہو پاتی کہ ان مقامات پر وہ لوگ میسر نہیں آتے جو اس ذریعہ کو انجام دے سکیں۔ اس مضمون میں ان تجربات کو پیش کیا گیا ہے جن کی بناء پر مدرسین قرآن کی ایک ٹیم تیار کی جاسکتی ہے۔ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔ خدا کرے یہ نافع ثابت ہو۔

(از اشراق، لاہور)

غزل

ابوالمجاہد زاہد

جب دماغ اہلِ گلشن کے جلنے لگے — لالہ و گل سے شعلے نکلنے لگے
ٹھوکروں کو سمجھ کر کرم وقت کا — گیند کی طرح نادان اچھلنے لگے
تشنگی، تشنگی ہو تو برداشت ہے — چشمۂ آبِ زمزم ابلنے لگے
برف کے جو بنائے گئے تھے محل — اک ذرا دھوپ نکلی پگھلنے لگے

صاف گوئی کی عادت برا ہو ترا
اب تو ہم دوستوں کو بھی کھلنے لگے

مناسکِ حج کی تاریخ

۲

محمد رضی الاسلام ندوی
۷۵، ایس ایس ہال علیگڑھ مسلم
یونیورسٹی علیگڑھ
یو۔پی

قربانی سے متعلق خواب

قرآن میں ہے کہ: ———

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس خواب کا تذکرہ بیٹے سے کیا اور پھر دونوں بعینہٖ خواب کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ ہو گئے۔

علامہ فراہی کا خیال ہے کہ یہ خواب تمثیلی تھا اور اسکی تعبیر یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت کیلئے وقف کر دیں، چنانچہ انھوں نے واقعہ قربانی پر بحث کرنے سے پہلے جو اصولی باتیں درج کی ہیں ان میں یہ بھی ہے۔

"غیب کے اسرار و احوال کبھی کبھی رویا کی شکل میں منکشف ہوتے ہیں۔ یہ رویا کبھی تو سپیدۂ صبح کی مانند بالکل روشن اور واضح ہوتی ہے اور کبھی تمثیل کے رنگ میں ہوتی ہے جس طرح کلام کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں کوئی کلام نہایت آشکارا

کے ساتھ اپنے مفہوم کو بتا دیتا ہے کوئی استعارہ کے رنگ میں ہونے کی وجہ سے تاویل و تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح رویا کی بھی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کی رویا تعبیر کی محتاج ہوتی ہے اور تعبیر بعض اوقات اس قدر دقیق ہوتی ہے کہ خود صاحب رویا سے بھی مخفی رہ جاتی ہے۔ حضرت یوسف کے دونوں جیل کے ساتھیوں اور پھر بادشاہ نے جو خواب دیکھا تھا۔ قرآن مجید میں مذکور ہے انکی تاویل سمجھنے سے وہ قاصر رہے۔ تورات میں بخت نصر اور دانیال نبی کے بھی بعض اسی قسم کے خواب مذکور ہیں جن کی تاویلیں ان پر بہت بعد میں کھلیں۔ یہی صورت حالات بعض مرتبہ انبیاء کو بھی پیش آجاتی ہیں۔ فہم تعبیر ایک مخصوص علم ہے جو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ایک مخصوص بصیرت و معرفت پر مبنی ہے۔ حضرت یوسف میں " وعلمتنی من تاویل الاحادیث " میں اسی علم کی طرف اشارہ فرمایا ہے "۔[۱۹]

علامہ فراہی نے پھر تورات کے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شریعت ابراہیمی میں قربانی کا مطلب راہ خدا میں نذر کرنا اور خدا کے گھر کی خدمت کیلئے وقف کرنا تھا۔[۲۰]

علامہ شبلی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

" اکابر صوفیہ نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں دو قسم کے ہوتے ہیں حقیقی اور تمثیلی۔ حقیقی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب دکھایا گیا تھا اس سے مراد یہ تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کیلئے نذر چڑھا دیں یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں اور اولاد میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو حقیقی خیال کیا اور بعینہ اسکی تعمیل کرنی چاہی۔ یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہو سکتی ہے اگرچہ یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اسپر متنبہ کر دیتا ہے اسی بنا پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا " قد صدقت الرؤیا انا کذالک نجزی المحسنین "۔[۲۱]

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی ایک دوسری تاویل کی ہے۔ علامہ شبلی کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

" بیچمدان کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو جذبت الہٰی سے سرشار تھے خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوق و اطاعت میں اس حکم الہٰی کی تعمیل اپنی طرف سے بعینہ و بلفظہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تاکہ اس ابتلاء میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ انکو خدمت توحید و تولیت کعبہ کیلئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لیکر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو خود اپنے لفظوں میں واضح فرما دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور آئی یا ابراہیم قد صدقت الرؤیا انا کذالک نجزی المحسنین (صافات)"۔[۲۲]

یہ صحیح ہے کہ خواب حقیقی بھی ہوتا ہے اور تمثیل کے رنگ میں بھی۔ اور تعبیر بعض اوقات اس قدر دقیق ہوتی ہے کہ خود صاحب رویا سے بھی مخفی رہ جاتی ہے لیکن انبیاء کا معاملہ اس سے مختلف ہے یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ صورت حال انبیاء کو بھی پیش آتی ہے۔ انبیاء پر وحی نازل ہونے کے جو طریقے ہیں ان میں ایک خواب بھی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی آپ رات میں جو خواب دیکھتے دن میں ٹھیک ویسا ہی پیش آتا۔[۲۳] اسی بنا پر جمہور امت کا اتفاق ہے کہ " رویا الانبیاء وحی " (انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے) اس لئے یہ بات کہ انبیاء خواب کو سمجھ نہ سکے ہوں صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

مذکورہ دعوی کی دلیل کے طور پر جو نظائر پیش کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت یوسف کے جیل کے ساتھیوں اور بادشاہ نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تاویل وہ نہیں سمجھ سکے تھے۔

۲۔ تورات میں بخت نصر اور دانیال نبی کے بھی اسی قسم کے خواب مروی ہیں۔

۳۔ حضرت یوسف نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔[۲۴]

۴۔ حضور نے مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں اور احد میں مسلمان شہداء کو مذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھا تھا۔[۲۵]

لیکن ان نظائر کا موازنہ جب ہم حضرت ابراہیم کے واقعہ سے کرتے ہیں تو ان سے کسی طرح مذکورہ دعوی ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت یوسف کے جیل کے ساتھی اور بادشاہ نبی نہیں تھے جبکہ ابراہیم نبی تھے بخت نصر کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا۔ دانیال نبی کے جو خواب مروی ہیں نہیں معلوم کہ وہ کس زمانے

سکے ہیں اور وہ ان کی تاویل سمجھ سکے تھے یا نہیں ۔ حضرت یوسف نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا اور وہ تعبیر سمجھ نہ سکے، یعقوب علیہ السلام نے سمجھایا لیکن یہ واقعہ ان کی نبوت سے پہلے کا ہے۔ اسی طرح حضور نے مدینہ کی وبا کو بڑھیا کی شکل میں اور احد میں مسلمان شہیدوں کو ذبح گایوں کی شکل میں دیکھا تھا لیکن آپ ان کی تاویل سمجھ گئے تھے الغرض کوئی نظیر ایسی نہیں جس میں خواب دیکھنے والا نبی ہو اور وہ خواب کی تعبیر نہ سمجھ سکا ہو۔

سورۂ صافات کی آیت سے بھی اس تاویل کا غلط ہونا مترشح ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے: "یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا" (اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا) گویا اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ ابراہیم خواب کو صحیح سمجھے تھے اسی لئے بعینہ اسکی تعمیل پر آمادہ ہو گئے تھے۔ آگے فرمایا: "ان ھذا لھو البلاء المبین" (حقیقتاً یہ ایک کھلی آزمائش تھی) "مبین" کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ آزمائش کوئی ڈھکی چھپی، دقیق اور ناقابل فہم نہیں تھی بلکہ کھلی ہوئی اور بالکل واضح تھی۔

ماضی قریب میں کچھ لوگوں نے اسی قسم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ مولانا مودودی نے ان کا پر زور رد کرتے ہوئے اپنے ایک مقالہ "تحقیق قربانی پر تنقید" میں جو کچھ لکھا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ یہاں میں اسے مستعار لیتا ہوں۔

"قرآن میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم نے خواب میں اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ پایا تھا اس کے امتثال میں وہ واقعی اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جب انھوں نے لخت جگر کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین وان ھذا لھو البلاء المبین" (الصافات: ۱۰۵-۱۰۶) اس قصہ کا صاف مفہوم جس کو ہر صاحب فہم آدمی پہلی نظر میں محسوس کر سکتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی آزمائش کرنی چاہی۔ اس لئے بیٹے کو ذبح کرنے کا صریح حکم نہ دیا، بلکہ کنایۃً خواب میں ایسا دکھایا کہ اپنے لخت جگر کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم چونکہ خدا کی محبت پر ہر محبت کو قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے اس لئے وہ محبوب حقیقی کے محض اس ذرا سے ڈھکے چھپے اشارے ہی پر بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے آمادہ

ہو گئے یہی اصل قربانی تھی اور جب یہ پوری ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے بیٹے کا خون بہانے سے ان کو روک دیا۔ اور ایک ذبح عظیم کو اس کا فدیہ بنا دیا۔

غور کیجئے یہ کتنا عظیم الشان واقعہ ہے اور "لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" (آل عمران ۹۲) کی روح کو کس شاندار طریقے سے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اب دیکھئے کہ عرشی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات محض قربانی کی مخالفت کی وجہ سے قرآن کے اس نہایت سبق آموز قصے کو کس طرح مسخ کرتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے دراصل خواب کا مطلب ہی غلط سمجھا، جوش ایمانی تو ان میں ضرور تھا اور شراب عشق کی سرمستی تک پہنچا ہوا تھا مگر فہم اتنی بھی نہ تھی جتنی عرشی صاحب اور مولوی احمد الدین صاحب مرحوم کو ارزانی ہوئی ہے۔ وہ خواب کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ بیٹے کو ذبح کر دو حالانکہ دراصل ذبح کرتے ہوئے دکھانے سے خدا کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس بیٹے سے دنیوی امیدیں منقطع کر کے اسے خدا کے دین کی عظیم خدمت کیلئے وقف کر دو۔ پس جب وہ اپنے لخت جگر کو پچھاڑ کر ایک صریح غلطی کا ارتکاب کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ فرمایا اور ذبح عظیم (یعنی بیٹے کو دین کیلئے وقف کرنے) کی طرف ان کی رہنمائی کی۔

اس تاویل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے "قد صدقت الرؤیا" فرما کر خود یہ تصدیق فرما دی کہ حضرت ابراہیم نے خواب کی تعبیر صحیح سمجھی تھی، فاضل مفسر نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کیلئے آیت کے ترجمے میں ایک ذرا سی تحریف کر دی لفظی ترجمہ یہ تھا کہ "تو نے خواب کو سچ کر دکھایا" انھوں نے اس کا ترجمہ کر دیا "تو نے خواب کو سچ کر دکھلایا" دیکھئے اس چھوٹے سے لفظ "تو نے" مفہوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جو تصدیق تھی وہ تعریض بن گئی اس کے بعد اگر "کذلک نجزی المحسنین" کا فقرہ بے معنی ہو گیا تو کچھ پرواہ نہیں رہا "ان ھذا لھو البلاء المبین" تو اس نئی تاویل سے اس کے معنی یہ قرار پائے کہ محض حضرت ابراہیم کے عقل کی آزمائش تھی کہ آیا وہ خواب کا مطلب صحیح سمجھتے ہیں

ہیں یا نہیں اور افسوس کہ بیچارے اس امتحان میں بری طرح فیل ہوئے ...“ [۲۹]

یہ تاویل دراصل مخالفین اسلام کے اعتراضات سے بچنے کیلئے کی گئی ہے جب کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے:

”قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھادیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیل کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے“ [۳۰]

لیکن بعض مخالفین اسلام کے اس اعتراض سے بچنے کیلئے واقعہ کی ایک غلط توجیہ کرنا مناسب نہیں۔ اس کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ اطاعت اور معصیت اعمال کے ذاتی اوصاف نہیں ہیں بلکہ خالق کے حکم یا نہی پر مبنی ہیں اگر ایک شخص کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ خالق نے اسے فلاں کام کرنے کا حکم دیا ہے تو وہ عین اطاعت ہو جاتا ہے جب کہ وہی کام دوسروں کیلئے معصیت ہوگا، اگر خالق نے انھیں اس کے نہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ ٹھیک یہی جواب متقدمین علمائے اسلام میں سے بھی بعض لوگوں نے دیا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں قاضی ابوبکر ابن العربی صاحب احکام القرآن کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

”اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا کیونکر حکم دیا جا سکتا ہے جبکہ یہ معصیت ہے اور معصیت کا حکم جائز نہیں ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ کتاب اللہ پر اعتراض ہے اس لئے اسے کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جو اسلام کو مانتا ہو چہ جائیکہ حلال و حرام کے فتوے صادر کرتا ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”افعل ما تؤمر“ اس سلسلہ میں جس بات سے اشتباہ رفع ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ معاصی اور طاعات افعال کے ذاتی اوصاف نہیں ہیں بلکہ جن کاموں کا حکم ہے انھیں کرنا اطاعت اور جن کاموں سے نہی آئی ہے انھیں کرنا معصیت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے اسماعیل کی قربانی کا حکم دیا گیا اس لئے وہ فعل ان کیلئے اطاعت اور آزمائش ہو گیا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان ھذا لھو البلاء المبین“ یعنی

نفس کو قابو میں رکھتے ہوئے بیٹے کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو جانا کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اور چونکہ ہمیں اپنی اولاد کو قربان کرنے سے روکا گیا ہے اس لئے اگر کوئی ایسا کرے گا تو یہ فعل معصیت ہوگا“ [۳۱]

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کی تاویل (جو اوپر بیان کی گئی) بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خواب کا مطلب سمجھ گئے تھے کہ اس سے مراد توحید کی خدمت اور کعبہ کی تولیت کیلئے بیٹے کو وقف کرنا ہے لیکن اس کے باوجود غلبۂ شوق و اطاعت میں بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تاکہ نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں۔ جبکہ مذکورہ تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ انبیاء کا خواب اگر تمثیلی ہو تب بھی وہ اس کی تعبیر سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اور اللہ کے حکم پر عمل کرنے کے بجائے غلبۂ شوق و اطاعت میں اپنی طرف سے ایسا کام کرنا جس کا اللہ نے حکم نہ دیا ہو ہرگز مستحسن نہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فجر میں دو رکعتیں فرض کی ہیں۔ اگر کوئی غلبۂ اطاعت میں چار فرض پڑھنے لگے تو اس کا یہ فعل بجائے مستحسن ہونے کے موجب گناہ ہوگا۔ اس لئے یہ تاویل دور از کار ہے شاید مولانا کو اس تاویل کے بعید ہونے کا احساس تھا اسی لئے انھوں نے آخر میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

”یہ تشریح ان بعض علماء کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں۔ ورنہ جمہور علماء اس رویا کو بھی بجا سمجھتے ہیں“ [۳۲]

کشمکش

[illegible]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

رضی الاسلام ندوی
۷۹ - رین بسیرا پال علی گڑھ
(دوسری قسط)

مناسک حج کی تاریخ

۳ - رمی جمار:

رمی جمار کے سلسلہ میں مشہور قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب قربانی کی نیت سے نکلے تو راستے میں شیطان نے انھیں بہکانا چاہا۔ اس وقت انھوں نے اسے کنکریاں ماریں۔ رمی جمار اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

لیکن علامہ فراہی کا کہنا ہے کہ یہ اس واقعہ کی یادگار ہے کہ اہل مکہ نے ابرہہ کا مقابلہ کیا تھا اور کنکریاں ماری تھیں۔ فرماتے ہیں: "بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں رمی جمرہ واقعہ فیل ہی کی یادگار ہے۔"[۴۲] انھوں نے اپنے اس نظریہ کے بہت سے وجوہ بیان کئے ہیں۔[۴۳] ذیل میں ہم انھیں اختصار کے ساتھ بیان کریں گے اور ساتھ ہی ان کا علمی جائزہ لیں گے۔

(۱) پہلی دلیل یہ ہے کہ "حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلے آرہے ہیں چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً اور تفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ ...... حج سے متعلق ساری چیزوں کا ذکر آپ کو شعرائے جاہلیت کے اشعار میں مل جائے گا لیکن رمی جمار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے اور واقعہ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔"

کلام جاہلیت میں رمی جمار کا تذکرہ نہ ہونا اس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ واقعہ فیل کی یادگار ہے۔ اگر حج کے دوسرے مناسک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلے آرہے تھے اور رمی جمار کا اضافہ واقعہ فیل کی اہمیت کے پیش نظر کیا گیا تو یہ ایک غیر معمولی فعل تھا جس کا اشارہ بعد کے شعراء کے کلام میں ضرور ملنا چاہئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عہد اسلام کے شعراء کے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ رمی جمار کا واقعہ فیل سے ادنیٰ سا بھی تعلق ہے۔ صرف شعری نہیں بلکہ نثری تحریروں اور تاریخ کی روایتوں میں بھی اس سلسلہ میں ادنیٰ سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

اور ایسا بھی نہیں کہ عہد جاہلیت میں رمی کا کوئی ثبوت نہ ملتا ہو۔ اس سلسلہ میں ہم جب تاریخ کی کتابوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو ہمیں ان میں رمی جمرات کا تذکرہ ملتا ہے۔ چنانچہ متعدد مورخین نے صراحت کی ہے کہ اہل عرب دور جاہلیت میں رمی جمرات کرتے تھے۔[۴۴]

جاہلیت کے بعض اشعار میں بھی رمی جمار کا اشارہ ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے حج میں رمی جمار کرتے تھے۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:

فأقسم بالذی قد کان ربی   والنصاب لدی الجمرات المغر[۴۵]

(میں قسم کھاتا ہوں اس ذات کی جو میرا رب ہے۔ اور ان معبود بتوں کی جو جمرات کے پاس ہیں)

حذیفہ بن انس الہذلی کا شعر ہے:

لأدرکہم شعث النواصی کأنہم   سوابق حجاج توافی المجمرا[۴۶]

(اس نے اس کو پا لیا اس حال میں کہ ان کی پیشانی کے بال پراگندہ اور غبار آلود تھے، گویا وہ حجاج ہوں جو سب سے پہلے رمی جمار کی جگہ پہنچ گئے ہوں)

جناب ابو طالب کے ایک قصیدے میں بھی جمرہ کا تذکرہ ہے۔ جب کفار مکہ کی مخالفتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں تو انھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں ایک قصیدہ کہا۔ ابن ہشام نے اس قصیدے کے ۹۴ اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں دیگر مناسک حج (بیت اللہ، حجر اسود، مقام ابراہیم، سعی بین الصفا والمروہ، عرفہ، مزدلفہ) کے ساتھ جمرہ کبریٰ کا بھی ذکر ہے۔

وبالجمرة الکبری اذا صمدوا لہا   یؤمون قذفا رأسہا بالجنادل
وکندة اذ ہم بالحصاب عشیة   تجیز بہم حجاج بکر بن وائل[۴۷]

(اور جمرہ کبریٰ کی قسم جب لوگ وہاں کا قصد کرتے ہیں اور کنکریوں سے اس پر رمی کرتے ہیں۔ اور کندہ کی قسم جب وہ لوگ شام کو رمی کی جگہ ہوتے ہیں)۔

یہ قصیدہ اگرچہ مکی دور کے اس زمانے کا ہے جب مشرکین کی مخالفت شدت اختیار کر چکی تھی۔ اس لئے اس سے عہد جاہلیت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا لیکن جس طرح انھوں نے دوسرے مناسک کے ساتھ جمرہ کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی قسم کھائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مناسک کے ساتھ اس پر اہل عرب عرصے سے عمل کرتے آئے تھے۔

عاشوراء کے دن کعبہ کو غلاف پہنایا جاتا تھا[۵۶] (جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے)، اور اسی تاریخ کو حضرت امام حسین کی شہادت بھی ہوئی۔ اب اگر اسی یکسانیت کی بنیاد پر کوئی حضرت موسیٰ سے متعلق روایت کو ضعیف قرار دے کر یوم عاشوراء کو شہادت حسین کی یادگار قرار دینے لگے تو اس کا یہ استدلال مہمل ہوگا۔

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ "اگر رمی کی اصل وہ ہوتی جو لوگوں نے سمجھی ہے یعنی شیطان کو سنگسار کرنا تو قربانی رمی سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے یا چوتھے دن ہونی چاہیے تھی۔ حالانکہ قربانی رمی کے پہلے ہی دن ہوتی ہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیطان دوسرے اور تیسرے دن کیوں سنگسار کیا جاتا ہے"۔ اس استدلال کے بعد علامہ فراہی نے اسے واقعہ فیل پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں۔ رمی کی سنت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی یادگار ہونے کے لیے ہر جز میں اس کی مماثلت ضروری نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ قربانی پہلے دن رمی کے بعد ہوتی ہے۔ اور نفس واقعہ کے اثبات کے لیے یہ کافی ہے۔ علامہ موصوف کے نزدیک صفا و مروہ کے درمیان سعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سرگرمی کی یادگار ہے جو انہوں نے قربانی کے لیے صفا کی طرف سے مروہ جاتے ہوئے دکھائی تھی۔ جو اعتراض انہوں نے یہاں کیا ہے وہی وہاں ان پر بھی ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ایک بار صفا سے مروہ کی طرف گئے تھے تو آخر یہ صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کیوں کی جاتی ہے؟

(۴) چوتھی دلیل علامہ فراہی نے یہ دی ہے کہ "رمی میں تینوں دنوں میں پہلے دن صرف اسی ستون پر کنکریاں مارتے ہیں جو عقبہ کے پاس ہے اور تینوں ستونوں میں مکہ سے قریب تر ہے اس روز بقیہ ستونوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ واقعہ کی فطری ترتیب بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے دن اصحاب فیل جوش میں آگے بڑھے ہوں گے لیکن جب عربوں نے پتھراؤ کر کے چہرے بگاڑ دیے تو ان کا نشہ جنگ ہرن ہو گیا ہوگا۔ دوسری طرف عربوں کے جوش بڑھ گئے ہوں گے اور انہوں نے مزید آگے بڑھ کر دوسرے دن حملہ کیا ہوگا....."

(۵) پانچویں دلیل یہ ہے کہ "جس ستون پر پہلے دن رمی کی جاتی ہے وہ تینوں میں سب

بڑا ہے اور فوج کے حالات کے لحاظ سے بھی یہی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے افراد کی تعداد بہت گھٹا دی ہوگی۔ اس وجہ سے دوسرے ستونوں کا حجم پہلے کے مقابلہ میں کم ہے۔ ان باتوں کو شیطان کے حالات سے کوئی مناسبت نہیں۔ جو شیطان حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے آیا تھا۔ اس کی یادگار میں یہ تدریجی تفاوت بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے..... الخ"

(۶) چھٹی دلیل یہ ہے کہ "پہلے اور دوسرے دن رمی کے بعد خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے دیر تک دعا کی جاتی ہے۔ لیکن تیسرے دن کی رمی وقوف اور دعا سے خالی ہوتی ہے۔ اگر یہ رمی شیطان پر ہوتی تو نہ پہلے دنوں میں اس درجہ اہتمام دعا کی کوئی وجہ ہوتی نہ تیسرے دن یک قلم ترک کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ قربانی اٹل تھا..... الخ"

یہ تینوں دلیلیں محض عقلی اور خیالی ہیں۔ ان کی بنیاد پر کسی چیز کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں نے جمرات کے ستون بنائے ہوں گے ان کے دل میں شاید یہی بات آئی ہو کہ پہلے ستون کو سب سے اونچا بنایا جائے تاکہ اس سے ابرہہ کی فوج کی کثرت کی طرف اشارہ ہو اور دوسرے ستون چھوٹے رکھے جائیں تاکہ ان سے ابرہہ کی فوج کم ہو جانے کا پتہ چلے ------ اور پہلے دن صرف عقبہ سے قریب والے ستون پر رمی کرنے اور آخری دن رمی کے بعد دعا نہ کرنے کی وہ حکمت شاید ہی شارع علیہ السلام کے ذہن میں آئی ہو جو علامہ فراہی نے بتلائی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا، رمی کی سنت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی یادگار ہونے کے لیے ہر جزء میں اس کی مماثلت ضروری نہیں ہے۔

(۷) ساتویں دلیل میں جمرہ کے مختلف معانی نقل کرنے کے بعد علامہ فراہی نے لکھا ہے "جمرہ ایسی جمعیت کو کہتے ہیں جس کو اپنی قوت و شوکت پر اس درجہ اعتماد ہو کہ کسی دوسری جماعت سے وابستہ ہونے کی وہ ضرورت نہ محسوس کرے..... اس کا بہترین مصداق صرف ابرہہ کی فوج ہی ہو سکتی ہے جو تمام قبائل سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے طاقت کے بھروسہ پر عرب پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اور چونکہ منی کے ستون اسی کے یادگار تھے اس وجہ سے ان کو جمرات کہا گیا"۔

انہوں نے جمرات کے سلسلہ میں جو اقوال نقل کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

"موطا" کی شرح زرقانی میں آتا ہے: "جمرات جمرہ کی جمع ہے۔ جمرہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کنکریوں کا انبار ہو۔۔۔۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اہل عرب چھوٹی کنکریوں کو جمار کہتے ہیں۔ اس وجہ سے تسمیہ باللازم کے اصول پر ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ بعضوں نے کہا کہ آدم علیہ السلام یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب شیطان آیا تو انہوں اس کو کنکریاں ماریں اور وہ بھاگا۔ بھاگنے کے لئے عربی میں "اجمر" کا لفظ آتا ہے اس وجہ سے ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ شہاب قرافی فرماتے ہیں جمار جگہ کو نہیں بلکہ کنکریوں کو کہتے ہیں۔ جمر کے معنی کنکری کے ہیں۔ چونکہ ان جگہوں پر کنکریاں زیادہ تھیں اس سبب سے بلحاظ مظروف ان کو جمرات کہنے لگے"

ان اقوال میں سے صرف اسی قول کو اختیار کرنا اور صحیح بتلانا جس سے اپنے اختیار کردہ قول کی تائید ہوتی ہو۔ یا اسے کھینچ تان کر اپنے مطلوبہ مفہوم میں لیا جا سکتا ہو۔ مناسب نہیں لفظ "جمرہ" کے جب دونوں طرح کے معنی پائے جاتے ہیں تو اسے دلیل کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا۔

(۸) آٹھویں دلیل یہ دی ہے کہ "اہل عرب ابو رغال کی قبر کو جس نے ابرہہ کو راستہ بتایا تھا سنگسار کرتے رہے، یہ اصحاب الفیل پر رجم کی نظیر ہے۔ اسلام میں ابو رغال کی قبر پر سنگساری بند کر دی گئی کیونکہ اولاً کسی مخصوص قبر کو سنگسار کرنا اسلام کی رفعت اور بلندی کے منافی ہے ثانیاً جب رمی جمرات واقعہ کی یادگار باقی رکھنے کیلئے کافی تھی تو پھر ابو رغال کی قبر کو سنگسار کرنے کی رسم کو باقی رکھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی"

اہل عرب عہد جاہلیت میں نفرت اور لعنت کا اظہار کرنے کے لئے رجم کرتے تھے [۵۷] چنانچہ وہ شادی شدہ زانی کو رجم کرتے تھے۔ اسلام نے اسے باقی رکھا۔ اسی طرح اہل عرب عام الفیل سے ابو رغال کی قبر کو سنگسار کرنے لگے۔ یہ سلسلہ اسلام کے بعد بھی جاری رہا۔ ایک شاعر کا قول ہے ۔

أرجم قبره في كل عام ... كرجم الناس قبر أبي رغال [۵۸]

(اس کی قبر کو ہر سال سنگسار کیا کرو جس طرح لوگ ابو رغال کی قبر کو سنگسار کرتے ہیں)

جریر جو عہد اموی کا شاعر ہے، فرزدق کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

إذا مات الفرزدق فارجموه ... كما ترمون قبر أبي رغال [۵۹]

(جب فرزدق مر جائے تو اسے رجم کرو جس طرح کہ ابو رغال کی قبر کو رجم کرتے ہو)

دوسرا مصرع بعض روایتوں میں "کرجمکم لقبر ابی رغال" ہے [۶۰]

یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) جو ساتویں صدی کے ہیں، نے اپنی کتاب "معجم البلدان" میں "مغمس" کے تحت لکھا ہے: "یہ مکہ کے قریب طائف کے راستے میں ایک جگہ ہے۔ ابو رغال یہیں مرا چونکہ اس نے ابرہہ کو راستہ بتایا تھا، اس وجہ سے اس کی قبر سنگسار کی جاتی ہے۔ [۶۱] علامہ فراہی نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

محمد لبیب البتنونی نے اپنی کتاب "الرحلة الحجازیہ" (طبع ۱۳۲۹ھ) میں لکھا ہے کہ "اہل عرب ابو رغال کی قبر کو ہجرت سے قبل پہلی صدی سے اب تک رجم کرتے آئے ہیں" [۶۲]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اہل عرب ہر زمانہ میں نفرت اور لعنت کے اظہار کے طور پر ابو رغال کی قبر کو سنگسار کرتے رہے ہیں۔ اسے اصحاب الفیل پر رجم کی نظیر بتانا اور یہ کہنا "کہ رمی جمرات واقعہ فیل کی یادگار کے لیے کافی تھی اس لیے اسلام میں ابو رغال کی قبر پر سنگساری بند کر دی گئی" صحیح نہیں۔

مذکورہ دلائل بیان کرنے کے بعد، علامہ فراہی نے ایک فصل میں اس تاویل کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیا ہے کہتے ہیں:

"رمی کے وقت جس شخص کا تصور یہ ہوگا کہ وہ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہے وہ اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ یا کوئی خاص جوش نہیں محسوس کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ یہ کنکریاں ایک پتھر پر پھینک رہا ہے۔ اس سے زیادہ وہ یہ سوچ سکتا ہے کہ شیطان کے فریبوں سے ہمیشہ کے لئے مامون ہوگیا اور زیادہ سے زیادہ یہی سمجھے گا کہ کچھ ہی دنوں کے لئے اس کے فتنوں کو اس نے زخمی کر دیا ہے۔ اس تصور کا اثر اس کی نظر میں معوذتین یا لاحول یا اذان کے اثر سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے قدرتی طور پر مناسک حج کی ادائیگی کے وقت جس جذبہ و جوش سے وہ اپنے آپ کو معمور پائے گا۔ اس رسم کی ادائیگی کے وقت اس جوش و جذبہ سے اس کا سینہ بالکل خالی ہوگا۔۔۔۔ ہاں اگر جمرات کی رمی کو واقعہ اصحاب فیل کی یادگار سمجھا جائے تو اس صورت میں ہمارے تصورات کا رخ بھی بالکل دوسرا ہوگا۔ اور اس وقت قدرتاً ہمارے احساسات و تاثرات کی کمیت و کیفیت بھی بالکل مختلف ہوگی۔ ہم ایک ستون پر چند کنکریاں مار کر اس عظیم الشان نصرت الٰہی کی یاد تازہ کریں گے جو اللہ کے مقدس گھر کے پاسبانوں کیلئے مخصوص ہوئی اور اس یاد سے ہمارے اندر جو جوش پیدا ہوگا اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا" [۶۳]

یہ اثرات و نتائج بھی سراسر ذہن کی اختراع ہیں جو ایک واقعہ کو پہلے سے مان کر نکالے گئے ہیں۔ علامہ فراہی کو شیطان کے رجم کرنے کی سنت میں کوئی تاثیر ہی نظر نہیں آتی حالانکہ اسلام کے اسرار و حکم جاننے والے بہت سے علماء نے اسی میں عظیم اثرات بیان کئے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسرار حج بیان کرتے ہوئے رمی جمار کے اسرار میں بیان کیا ہے:

"وایضا ورد فی الاخبار ما یقتضی انه سنة سنها ابراهیم علیه السلام حین طرد الشیطان، ففی حکایة مثل هذا الفعل تنبیه للنفس ای تنبیه" ٦٣

(اسی طرح روایتوں میں آتا ہے کہ یہ (یعنی رمی جمار) ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے جب آپ نے شیطان کو بھگایا تھا۔ اس فعل کی نقل کرنے سے نفس کو شدید تنبیہ ہوتی ہے)

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں رمی جمار سے متعلق لکھا ہے:

"اس سے مقصود مجرد امتثال امر ہے تاکہ مکمل عبودیت کا مظاہرہ ہو سکے۔ عقل اور نفس کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، مزید برآں اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تشبیہ ہے۔ اس لئے کہ ابلیس ملعون اسی جگہ ان کے حج میں شبہ پیدا کرنے یا کسی معصیت میں مبتلا کرنے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اس کو کنکریاں ماریں تاکہ وہ ان کے پاس سے دفع ہو جائے اور اس کو ان سے کوئی توقع ہی باقی نہ رہ جائے۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ان کے سامنے شیطان حقیقت میں آگیا تھا اس لئے انھوں نے مارا، میرے سامنے تو شیطان نہیں ہے کہ میں اس کو ماروں تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ خیال بھی شیطان ہی کا پیدا کردہ ہے۔ اور وہی ہے جس نے یہ خیال تمہارے دل میں ڈالا ہے۔ تاکہ شیطان کو ذلیل و خوار کرنے کا جو عزم اور ارادہ تمہارے اندر تھا وہ کمزور پڑ جائے۔ تمکو جاننا چاہئے کہ ظاہر میں تم جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارتے ہو لیکن حقیقت میں وہ کنکریاں شیطان کے منہ پر پڑتی ہیں اور اس کی کمر توڑ دیتی ہیں۔ اس لئے کہ اس کی تذلیل و توہین سب سے زیادہ اس تعمیل حکم سے ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اطاعت محض کے جذبے کے ساتھ ہو۔ نفس یا عقل کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو" ٦٥

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ رمی جمار کو واقعہ اصحاب فیل کی یادگار قرار دینا صحیح نہیں

علامہ فراہی نے فصل کی ابتداء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شیطان کو رجم کرنے کے سلسلہ میں مختلف اور متضاد روایتیں نقل کی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ہم یہی کہیں گے کہ ان کو بالکل رد کر دینے کے بجائے ان کی تنقیح مناسب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب قربانی یا مناسک کی ادائیگی کے لئے نکلے تو شیطان نے بہکانا چاہا اس وقت انہوں نے اسے کنکریاں ماریں۔ یہ اس وقت لعنت کرنے کا طریقہ تھا۔ اسی واقعہ کی یادگار رمی جمار کی صورت میں قائم کر دی گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جسے انہوں نے مرفوعاً بیان کیا ہے، اس کی تائید ہوتی ہے:

"عن ابن عباس رضی الله عنهما رفعه الی النبی قال لما اتی ابراهیم خلیل الله صلوات الله علیه وسلامه المناسك عرض له الشیطان عند جمرة العقبة، فرماه بسبع حصیات حتی ساخ فی الارض ثم عرض له عند الجمرة الثانیة فرماه بسبع حصیات حتی ساخ فی الارض، ثم عرض له عند الجمرة الثالثة فرماه بسبع حصیات حتی ساخ فی الارض، قال ابن عباس رضی الله عنهما: الشیطان ترجمون وملة ابراهیم تتبعون" ٦٦

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ جب مناسک ادا کرنے لگے تو شیطان جمرہ عقبہ کے پاس ظاہر ہوا۔ آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں جس سے وہ زمین میں دھنس گیا۔ پھر جمرہ ثانیہ کے پاس ظاہر ہوا تو آپ نے سات کنکریاں ماریں جس سے وہ زمین میں دھنس گیا۔ پھر جمرہ ثالثہ کے پاس ظاہر ہوا تو آپ نے سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ زمین میں دھنس گیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "تم لوگ شیطان کو رجم کرتے ہو اور ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہو")

اسی لئے رمی جمار کے آداب میں سے یہ بتلایا گیا ہے کہ کنکریاں مارتے وقت اللہ اکبر کے ساتھ یہ بھی کہے:

"علی طاعة الرحمن ورغم الشیطان" ٦٧

(رحمان کی اطاعت اور شیطان کی رسوائی کے ساتھ)

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کے ساتھ حج کیا۔ انہیں مناسک حج سکھاتے اور خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ "مجھ سے مناسک حج سیکھو" اس لئے کہ تم اپنے باپ (ابراہیم) کے وارث ... اس سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ حج میں جو مناسک و شعائر ہیں وہ حضرت ابراہیم

(۱۹) کتاب پیدائش باب ۲۲ : ۲

(۲۰) سورۃ الصافات آیات ۱۰۰ – ۱۱۲

(۲۱) سورۃ الانبیاء : ۷۲

(۲۲) فراہی، ذبیح کون ؟ صفحہ ۸۹ – ۹۰ اور صفحہ ۱۳۷ – ۱۳۸

(۲۳) سورۃ ابراہیم آیت ۳۷

(۲۴) ابن کثیر، تفسیر القرآن الکریم جلد ۲ صفحہ ۵۴۰ تفسیر آیت مذکور، فخر الرازی نے بھی آیت "رب اجعل ھذا البلد امنا" کو خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد کی دعا قرار دیا ہے دیکھئے مفاتیح الغیب الجزء ۱۳/ صفحہ ۱۵۰ تفسیر آیت مذکور

(۲۵) ابن کثیر التفسیر جلد ۲ صفحہ ۵۴۱ تفسیر آیت مذکور

(۲۶) ابن جریر طبری، جامع البیان الجزء ۱۳/ صفحہ ۱۵۲ تفسیر آیت مذکور

(۲۷) فخر الرازی، مفاتیح الغیب موسوم بتفسیر کبیر الجزء ۱۳/ صفحہ ۲۵۴

(۲۸) غالباً قاضی سے مراد قاضی عبدالجبار معتزلی ہیں۔ جن کا رازی حوالہ دیا کرتے ہیں

(۲۹) رازی التفسیر الکبیر الجزء ۱۳/ صفحہ ۲۵۴

(۳۰) فراہی، ذبیح کون ؟ صفحہ ۲

(۳۱) ایضاً واقعہ ذبح کے بارے میں اصولی مباحث

(۳۲) شبلی نعمانی، سیرت النبی اول صفحہ ۱۳۶، علامہ شبلیؒ نے یہ بات سیرت النبی میں کئی جگہ لکھی ہے۔ دیکھئے سیرت النبی اول صفحہ ۱۳۶ اور صفحہ ۱۵۸، سید سلیمان ندوی نے اگرچہ یہاں اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن سیرت النبی کے پانچویں حصہ میں خود بھی یہی بات لکھدی ہے۔ دیکھئے سیرت النبی پنجم صفحہ ۳۴۶

(۳۳) سیرت النبی اول صفحہ ۱۳۶، حاشیہ

(۳۴) صحیح بخاری باب بدء الوحی

(۳۵) شبلی، سیرت النبی اول صفحہ ۱۵۸، صفحہ ۱۳۶ حاشیہ

(۳۶) ایضاً صفحہ ۱۳۹ حاشیہ از سید سلیمان ندوی

(۳۷) سورۃ الصافات آیت ۱۰۵

(۳۸) ایضاً آیت : ۱۰۶

(۳۹) مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیمات، دوم صفحہ ۲۴۹ – ۲۵۰ مولانا مودودیؒ نے سیرت سرور عالم ۵۹۴ - ۶۰ میں بھی خواب کے حقیقی ہونے کے کچھ دلائل دیئے ہیں۔

(۴۰) شبلی، سیرت النبی اول صفحہ ۱۳۵

(۴۱) قاضی ابوبکر بن العربی، احکام القرآن، تحقیق علی محمد البجاوی ۱۶۱۹/۴

(۴۲) سیرت النبی اول صفحہ ۱۳۷

(۴۳) فراہی، تفسیر سورۃ فیل صفحہ ۵۶ (ترجمہ امین احسن اصلاحی)

(۴۴) یہی بات مولانا حمید الدین اصلاحی نے بھی لکھی ہے دیکھئے اسلام ایک نظر میں صفحہ ۱۲۹ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی نے دونوں اقوال نقل کر دیئے ہیں (سیرت النبی پنجم صفحہ ۳۴۳)

(۴۵) فراہی، تفسیر سورۃ فیل فصل ۱۵ صفحہ ۸۶ – ۹۰

(۴۶) ڈاکٹر جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام ۲۲/۵ طبع بغداد ۱۹۵۲ و شوقی ضیف العصر الجاہلی صفحہ ۹۳۔ محمد لبیب البتنونی، الرحلۃ الحجازیہ صفحہ ۱۹۰

(۴۷) جواد علی، المفصل ۱۳/۵ حاشیہ

(۴۸) ابن منظور، لسان العرب ۲۱۷/۵ مادہ "جرہ"

(۴۹) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۲۹۳/۱

(۵۰) جواد علی المفصل ۲۲/۵ – ۲۳۱

(۵۱) سورۃ شعراء : ۱۱۲

(۵۲) سورۃ ہود : ۹۱

(۵۳) کتاب پیدائش باب ۳۱، کتاب تشریح باب ۴ : ۲۲ – ۲۵، انجیل متی باب ۲۱ : ۱۹

(۵۴) جواد علی، المفصل ۲۳/۵

(۵۵) سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن سوم صفحہ ۵۲۳

(۵۶) صحیح بخاری، کتاب المناسک باب قول اللہ جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام

(۵۷) محمد لبیب البتنونی نے ایسی کئی قبروں کا تذکرہ کیا ہے جن پر اہل عرب نفرت کے طور پر رجم کیا کرتے تھے ۔ دیکھئے الرحلۃ الحجازیہ صفہ ۱۹۲

(۵۸) جواد علی ، المفصل ۳/۵۱۴

(۵۹) مروج ۲/۵۳ ، البدایہ ۲/۱۷۰ بحوالہ جواد علی ، المفصل ۳/۵۱۴

(۶۰) جواد علی المفصل ۳/۵۱۴ ، بعض روایتوں میں "کما یرجمون قبیل ابی رغال" ہے ۔ دیکھئے الرحلۃ الحجازیہ صفہ ۱۹۲

(۶۱) یاقوت الحموی : معجم البلدان ۳/۵۱۳ ، "المغمس"

(۶۲) عربی عبارت یہ ہے "وهم يرجمون من القرن الاول قبل الهجرة الى الآن قبر ابى رغال فى المغمس بين مكة والطائف" ، الرحلۃ الحجازیہ صفہ ۱۹۱

(۶۳) فراہی ، تفسیر سورۂ فیل صفہ ۹۷-۹۸

(۶۴) شاہ ولی اللہ ، حجۃ اللہ البالغہ ۲/۹۰

(۶۵) الغزالی ، احیاء العلوم ۱/۳۴۲ بحوالہ ارکان اربعہ ابو الحسن علی ندوی صفہ ۳۰۲-۳۰۳

(۶۶) اسے ابن خزیمہ ، احمد و حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیحین کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے ۔

(۶۷) الغزالی ، احیاء العلوم ۴/۳۹۷

(۶۸) شاہ ولی اللہ ، حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۲

• خالی ہاتھ لوٹاتے خدا شرماتا ہے •

رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا ! اللہ حیادار اور سخی ہے ، جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے پھیلاتا ہے تو ناکام خالی ہاتھ لوٹاتے اسے شرم آتی ہے

ترجمہ ۔ ابو داؤد ۔ ترمذی

تلخیص : محمد اقبال احمد صفدری

ایم ۔ اے ، بی ایڈ

سیّد جمال الدین افغانیؒ

تقریباً ایک سو چالیس سال قبل افغانستان کے ایک معروف کونڑی سید جناب صفدر کے یہاں ایک بچے نے جنم لیا ، جس کا نام جمال الدین رکھا گیا یہ وہی بچہ ہے جس نے نصف صدی سے زیادہ مسلمانوں اور ایشیا کے مظلوم عوام کے لئے یورپ کے نوآبادیاتی استبدادی نظام کے خلاف تنہا علم جہاد بلند رکھا ۔

درحقیقت انیسویں صدی کے اواخر میں جمال الدین افغانی مسلمانوں کے لئے واحد روشنی اور امید کی کرن تھے اس وقت مسلم عوام نوآبادیاتی نظام اندرونی خلفشار اور افلاس کے تحت زندگی گذار رہے تھے ۔ اور انہیں جمال الدین افغانی جیسے رہنما کی سخت ضرورت تھی ۔ اس وقت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ افغانیؒ مشرق کی عظیم شخصیات اور نشاۃ ثانیہ کے علمبرداروں میں سے ایک تھے ۔ ان کی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم سیاسی رہنما اور روشن مفکر کی حیثیت سے منفرد ہیں ۔ عظیم فرانسیسی فلاسفر اور محقق رینن سید جمال الدین افغانیؒ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں ۔

جمال الدین افغانیؒ سے دوران گفتگو میں اسقدر متاثر ہوا کہ میں نے سار بان میں تقریر کرنے کیلئے "روح سائنس اور اسلام کا تعلق" جیسے موضوع کا انتخاب کیا ۔ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ گویا ابو علی سینا یا ان جیسے دوسرے عظیم رہنماؤں نے پھر سے زندگی پائی ہے ، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گذشتہ پانچ سو سال سے انسانی ذہن کو راستہ دکھایا ہے ۔ جمال الدین افغانیؒ کی جس چیز نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کا آزاد خیال اور بلندی کردار ہے یورپ کے اس عظیم فلسفی کے مندرجہ بالا بیانات سے سید افغانیؒ کی عظمت کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے ۔ جن کے بارے میں نہرو نے بھی خیالات کا اظہار کیا کہ جمال الدین افغانیؒ ایک عظیم مذہبی مصلح تھے ڈاکٹر اقبال اور نامک کمال کے مطابق وہ

---

۱ ایک انگریزی ماہنامہ "دی جرنل" سے ماخوذ ، از ڈاکٹر عبد الحکیم ۔

ایک مذہبی انقلاب پسند، اسلامی آفاقیت کے علمبردار تھے۔ انقلاب ایران کا مصنف ایڈورڈ جی براؤن لکھتا ہے کہ جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کے اندر یورپ کے نوآبادیاتی نظام اور توسیع پسندی کے خلاف جذبہ جہاد بیدار کر دیا اور قوت مدافعت کو جلا بخشی۔

بہت سے لوگ تاریخ کی عظیم شخصیات کو قیمتی پتھروں جیسے فیروزہ، زمرد اور یاقوت سے تشبیہ دیتے ہیں ——— مگر جمالؒ ایک ہیرے کے مانند ہیں جو ہر زاویے سے دل آویز ہوتا ہے۔ موصوف ایک مصلح، ایک مذہبی رہنما، فلسفی، مصنف، صحافی اور سب سے بڑھ کر ایک سیاسی اور بیدار مغز رہنما تھے۔ جنہوں نے مشرق اور اسلامی دنیا کو بیدار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ درحقیقت جمال الدینؒ افغانی کو جس چیز نے ہیرو بنا دیا۔ وہ ان کی وہ کھلی لڑائی اس نوآبادیاتی قوت سے تھی، جس کے ایجنٹ اور جاسوس ہر وقت ہر لمحہ علامہ کی جان کے درپے تھے اور ان کی تحریک کے اثرات نے خلیج بنگال سے لیکر افریقہ تک میں بیداری کی روح پھونک دی اور افغانستان کی سرحدوں کی پرواہ نہ کی۔

جمال الدینؒ کے کارناموں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک فکری تحریک ۔ جسے دنیا کے کسی گوشے سے کوئی تعاون نہیں حاصل تھا۔ خود بھی خالی ہاتھ تھا مگر اس وقت کے زبردست نوآبادیاتی نظام کے سامنے سینہ سپر ہو گیا یہی ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ افغانی اور عبدہ کے معتقد کے برخلاف افغانیؒ ایک بے لوث اور بیدار مغز رہنما تھے۔ جبکہ ایشیا اور افریقہ خصوصاً اسلامی دنیا خواب غفلت میں محو تھے افغانی نے اپنی تحریک شروع کی، اور مشرقی، افریقی و ایشیائی اور مسلم عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کے پاس ہتھیار کے طور پر صرف قلم اور ان کی روحانی قوت تھی۔ جس نے مشرقی عوام کی بیداری کے لیے جرس صور کا کام کیا اور بھٹکے عوام کو یورپ جیسی مادہ پرست قوت سے نبرد آزما ہونے پر آمادہ کر دیا۔ اور آخری فتح نے مشرقی عوام کے قدم چومے۔ ان کی تحریک نہ صرف یہ کہ ایشیا اور افریقہ میں بھی بلکہ یورپ کے قلب میں لندن، پیرس، ویانا، پیٹرزبرگ، برگ جیسے شہروں میں بھی اس کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس طرح انھوں نے اپنی جنگ جہاں اور جیسے بھی موقع ملا جاری رکھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مرحوم کو اپنی زندگی میں اس کے ثمرات دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ مگر ان کی وفات کے بعد جو پودا انھوں نے لگایا تھا۔ اس نے پوری اسلامی اور مشرقی دنیا کو بار آور کیا۔ آپ کی وفات کے محض ۲۰ سال بعد مرحوم کے مادر وطن افغانستان نے میر امان اللہ خان مرحوم کے عہد حکومت میں ان کے ایک شاگرد محمود طرزی کے ذریعہ آزادی حاصل کی جو کہ

ان کی خواہش تھی کہ ان کے چہیتے شاگرد امیر محمد اعظم خان اس نیک کام کو انجام دیں۔

مصر میں جدید مصر کے معماران کے انتہائی مخلص شاگرد سعد زغلول نے اس کام کو انجام دیا۔ ترکی میں نامک کمال کے شاگرد اتاترک مصطفٰے کمال کے ذریعہ یہ کام ہوا۔ سید رحمۃ اللہ کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلم مل کر برطانوی سامراج سے نجات حاصل کریں۔ انھیں اصولوں کو علامہ اقبالؒ، مولانا آزادؒ، گاندھی جی، پنڈت نہرو نے اپنایا اور سید افغانیؒ کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

دنیائے اسلام کا اتحاد آپ امت عربی کے ذریعہ چاہتے تھے۔ ان کا صدر مقام سعودی عرب میں تھا۔ وہ عرب لیگ کے قیام کے حق میں تھے۔ جس کا وجود پہلی عالمی جنگ کے فوراً بعد عمل کے کنارے ہوا۔

سید افغانیؒ کو ... نے قدامت پرست، اور مصلح کا خطاب دیا گیا۔ آج دنیائے اسلام نے وہی جانداری اختیار کی جس کی وکالت سید افغانیؒ کرتے تھے۔ یعنی سخت قسم کی قدامت پرستی اور بے لگام مغربیت نہ ہو کر درمیان کی راہ اختیار کی۔ یہی آواز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سیدؒ نے بھی لگائی تھی۔ آج دینی خیالات ساری دنیائے اسلام میں عام ہیں۔ اس سے مولانا افغانیؒ کی پیش بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی سید افغانیؒ نے یہ نظریہ پیش کیا۔ جناب حسن فہمی اور ان کے رفقائے کار نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ جس کی شدت کم کرنے کے لئے سید افغانی رحمۃ اللہ علیہ کچھ دنوں کے لئے ترکی چلے گئے۔

مصر میں

سید افغانی ۱۸۷۱ء میں مصر تشریف لائے۔ اور وہاں ۸ سال مقیم رہے۔ مصر ان کے لئے نئی جگہ نہ تھی۔ بلکہ جب وہ ۱۸۶۹ء میں استنبول جا رہے تھے تو چالیس دنوں تک مصر میں قیام رہا اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اس بار مصر کے ایک مشہور سیاستدان جناب ریاض پاشا نے خیر مقدم کیا۔ اور علامہ افغانیؒ کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ جامع ازہر کو ایک جدید طرز کی یونیورسٹی بنائیں۔ تاکہ جدید دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ علامہؒ کے شاگرد رشید جناب عبدہؒ رقم طراز ہیں۔ کہ علامہ افغانیؒ نے اپنے قاہرہ قیام کے دوران نہ صرف یہ کہ نوجوان مصریوں کے ذہنوں میں آزادی کے شعلے بھڑکا دیے بلکہ سیاسی صحافت کے توسط سے رائے عامہ کو بیدار کر کے اس قابل بنا دیا کہ مغربی اثرات کے خلاف سینہ سپر ہو سکیں۔ سید افغانیؒ نے اسوقت کی مصری صحافت کو بہت متاثر کیا اور بہت سے اخبارات کو لائسنس افغانی کی مدد سے ملے۔

یونظارہ زرقا کی بنیاد ان کے ایک یہودی شاگرد یعقوب سانوع نے مارچ ۱۸۷۷ء میں ڈالی "مصر" نامی روزنامہ مولانا افغانیؒ کے ادارت میں شائع ہوتا تھا جو شروع شروع میں قاہرہ سے نکلتا تھا۔ اس کے بعد اسکندریہ سے بھی ان کے دو شامی عیسائی شاگرد ادیب اسحاق اور سلیم النقاش کی ادارت میں نکلنے لگا۔ افغانیؒ نے ان کو ایک اور روزنامہ "التجارۃ" کی پرمٹ کے حصول میں مدد کی۔ اور اپنے ایک دوسرے عیسائی شامی شاگرد سلیم انحوری کو بھی ایک اخبار مرآت الشرق کی پرمٹ کے حصول میں مدد کی۔ ادیب اسحاق نے ایک اور اخبار "الفطاط" کو فرانسیسی اور عربی زبان میں نکالا۔

سید جمال الدین افغانیؒ نے سیاسی صحافت کے ذریعہ نوجوانوں میں بیداری کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ عملی طور سے مصری سیاست میں حصہ لیا۔ ایسٹرن اسٹار لاج کے باقاعدہ ممبر بن گئے انھوں نے ولی عہد شاہزادہ توفیق پاشا کو بھی اس کا ممبر بنایا۔ شاہزادہ توفیق ہی مستقبل میں مصر کا خدیو بنا۔ علامہ افغانیؒ نے شہزادہ توفیق کی عبدالحلیم کے مقابلہ میں حمایت کی۔ محمد علی پاشا کے یہ دونوں لڑکے تھے۔ علامہ افغانیؒ کو یہ امید تھی کہ جب توفیق کو اقتدار حاصل ہوگا تو انھیں اپنا کام کرنے میں بہت زیادہ سہولت ہوگی توفیق کے اقتدار میں آنے کے بعد علامہ کے چند مضامین "برطانیہ اور افغانستان" کے موضوع پر شائع ہوئے۔ ان میں ان کی برطانیہ سے دشمنی عیاں تھی۔ ان مضامین میں علامہ نے اپنے ملک کی حمایت کی ہے۔ اور برطانیہ کے ظالمانہ نظام کے خلاف لوگوں کو ہتھیار اٹھانے کی تلقین کی ہے

۲۴ مئی ۱۸۷۹ء کو اسکندریہ میں جو تقریر علامہ افغانیؒ نے کی، اس کی وجہ سے انھیں "حکیم الشرق" کا خطاب ملا۔ اسکندریہ میں علامہ افغانیؒ کا استقبال ایک ہیرو اور نجات دہندہ کی طرح کیا گیا۔ ضیفیہ ہال میں انھیں تقریر کرنی تھی۔ داخلہ بذریعہ پاس تھا مگر اتنا ہجوم تھا کہ منتظمین کے پاس ٹکٹ کے کاغذ تک نہ بچے۔ اور اس کی ساری آمدنی اسکندریہ کے غریب عوام کے لئے رفاہی کاموں پر خرچ کی گئی۔ اسکندریہ کے بعد وہی طریقہ علامہ مرحوم نے کلکتہ میں بھی اپنایا۔ اور جتنی رقم دستیاب ہوسکی کلکتہ کے غریب عوام پر خرچ کردی گئی۔

جس کام کیلئے مدر ٹریسا کو نوبل پرائز دیا گیا وہ کام مولانا مرحوم نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء کے دوران مصری سیاست کو علامہ نے بہت متاثر کیا۔ علامہ کے ایک قریبی مصری ساتھی شریف پاشا اصلاحات کے نفاذ کے لئے مولانا کے شانہ بشانہ تھے۔ اور مخالفت

جو مخالف گروہ کی طرف سے ہو رہی تھی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ مخالف گروہ کا قائد اسمٰعیل خدیو تھا۔ علامہ نے توفیق پاشا کی حمایت اسی لئے کی تھی کہ وہ آسانی سے اپنی اصلاحات کا نفاذ کرا سکیں گے مگر ستم ظریفی یہ کہ توفیق پاشا نے برطانوی سامراج کے ساتھ مل کر علامہ کو مصر سے ملک بدر کر دیا۔ اس طرح مولانا نے شامی ممالک کا جو خواب دیکھا تھا بکھر گیا۔ جن حالات سے افغانستان، ترکی اور ایران میں سابقہ پڑا وہی حالات یہاں بھی پیش آئے۔ مولانا کا قیام مصر میں ۱۸۷۱ء تا ۱۸۷۹ء رہا۔ اس قیام کے دوران فری میسانت اور نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم اور اپنی سیاسی صحافت کے زور سے ایک نئی سیاست کی بنا رکھی ۱۸۷۹ء میں علامہ مرحوم نے مصر سے رخت سفر باندھا اور ان کی پہلی منزل کراچی تھی۔ کراچی میں برطانوی سامراج نے کابل میں اپنے سفیر کے قتل کے سلسلہ میں تفتیش کے لئے کئی ماہ روکے رکھا۔

ہندوستان میں

علامہ مرحوم کا قیام ہندوستان میں ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۲ء تک رہا۔ مولانا کو یہ احساس تھا کہ ہندوستان میں اسلام کے آفاقی اصولوں کی بنیاد پر لوگوں کو یکجا نہیں کیا جا سکتا اس لئے قوم پرستانہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں سے اپیل کی کہ باہم یکجا ہو کر برطانوی سامراج کے خلاف متحدہ جدوجہد شروع کریں۔ اس نظریہ کی تبلیغ کے لئے حیدرآباد سے محمد حسن کی ادارت میں شائع ہونے والا اخبار "معلم شفیق" رہا جس میں متعدد مقالے لکھے مگر انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ سرسید جیسے لوگ برطانوی سامراج سے لڑنے کے بجائے تعاون پر آمادہ ہیں۔ برطانوی سامراج نے قادیانیوں اور نیچریوں سے ساز باز کر کے علامہ مرحوم کی تحریک کا مقابلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اپنے "تفسیر" نامی مضمون میں سرسید کی شدید مزاحمت کی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ علامہ افغانیؒ کے سیاسی خیالات ہی تھے جن کی وجہ سے ان کی شہرت اقصائے عالم میں پہنچ گئی۔ انیسویں صدی میں علامہ مسلم افریقی اور ایشیائی عوام کے مسیحا کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ جس نے یورپ کے سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کو لرزہ براندام کر دیا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے پانچ اصول وضع کئے تھے۔ کہیں کہیں تو ان اصولوں کو الگ الگ بھی پیش کیا بقول علامہ افغانیؒ "

"برطانیہ کے مستقل اصول نہیں بلکہ اس کے مستقل مفادات ہیں"

مولانا کے پانچ اصول مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) علامہ قوم کی اوپری سطح پر اصلاح کرنا چاہتے تھے ۔ وہ مقتدر لوگوں کی اصلاح پہلے کرنا چاہتے تھے۔ اس کے ذریعہ وہ ایک مثالی مملکت چاہتے تھے جس کی پیروی تمام اسلامی اور ایشیائی ممالک کریں۔

(۲) ان کی خواہش تھی کہ جرمنی اور فرانس تیسری قوت کی حیثیت سے برطانیہ اور زار روس کے خلاف ایشیائی عوام کی مدد کریں ۔

(۳) اگر مندرجہ بالا اصول ناکام ہو جائیں تو ان کی خواہش تھی کہ برطانیہ زار روس کے خلاف ایشیائی عوام کی مدد کرے ۔

(۴) یا پھر زار روس ہی سے برطانیہ کے خلاف مدد لی جائے ۔

(۵) آخری اور پانچواں اصول یہ تھا کہ سارے عالم اسلام کو متحد کرکے علیحدہ اپنے مقاصد حاصل کئے جائیں گے

ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے لئے علامہ افغانیؒ نے اپنے تئیں کام کرنا شروع کیا جبکہ علامہ افغانی ۱۹ سال کی عمر میں امیر دوست محمد کے بارے متفکر تھے ۔ ان کا کام شہزادوں کو معلومات عامہ کا درس دینا تھا ۔ انھوں نے شہزادہ اعظم خان پر خاص توجہ دی کیونکہ اعظم خان بہت زیادہ فعال اور حوصلہ مند تھے ۔ انھیں امید تھی کہ اعظم خان کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرسکیں گے ۔ انھیں امید تھی کہ اعظم خان مستقبل کے حکمراں ہونگے ۔ مگر شیر علی خان افغانستان کے حکمراں بنے ۔ ان دونوں شہزادوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی ۔ اور مولانا بد دل ہوکر ملک سے باہر چلے گئے ۔ یہ واقعات ۱۸۶۳ء کے ہیں ۔ مولانا مکہ معظمہ حج کی غرض سے وارد ہوئے ۔ ادائے گی حج کے بعد آپ عراق چلے گئے ۔ عراق کے قیام کے دوران ہی مولانا کو معلوم ہوا کہ شیر علی خان کو شکست ہوگئی اور افضل خان نیا حکمراں بنا جو کہ اس وقت قید تھا ۔ علامہ افغانی بڑی سرعت کے ساتھ ہرات میں مختصر قیام کے بعد کابل جا پہنچے اور قندھار میں اپنے عزیز دوست سے ۱۸۶۶ء میں مل گئے ۔ قندھار سے غزنی پہنچے جہاں افضل خان کے انتقال کی خبر ملی ۔ مولانا اعظم خان کیساتھ کابل پہنچے اور اعظم خان افغانستان کے حکمراں بنے ۔ علامہ افغانی اس کے مشیر بنے مگر بد قسمتی سے اس کا عہد حکومت بھی انتہائی مختصر رہا ۔ اس وقت کا ان کا زریں کارنامہ روزنامہ "کابل" کا اجراء تھا ۔ اعظم خان افغانی کے مشورے سے برطانوی حکومت سے آزادی کی بات چیت کر رہا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ برطانیہ افغانستان کی آزادی کی تاریخ کا اعلان کردے

اعظم خان کے ۱۸۶۷ء میں اعلان حکمرانی کے بعد ہمیشہ یہ سوال رہا کہ وہ تخت کا وارث کیسے بنگیا ۔ شیر علی خان نے بہادر بھتیجے عبدالرحمن خان کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کابل پر قبضہ کرلیا اور دوبارہ حکمراں بن بیٹھا یہ واقعہ ۱۸۶۸ء کا ہے ۔ اعظم خان ایران چلا گیا اس کے فوراً بعد جستام میں انتقال کر گیا ۔

اب جمال الدین افغانی کے پاس اعظم خان کے دوست اور مشیر ہونے کی حیثیت سے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی خدمات کو اسلام اور دنیا کے مظلوم عوام کے لئے وقف کردیں آخر ۱۸۶۹ء میں ملک کو خیرآباد کہدیا ۔ چالیس دن مصر میں قیام کے بعد استنبول چلے گئے ۔ استنبول میں قیام کے دوران اپنا تعلق "تنظیمات" نامی تنظیم سے قائم کیا ۔ یہ واقعہ ۱۸۷۰ء کا ہے ۔ علی پاشا اور فواد پاشا جیسے بااثر وزرا نے مولانا کا خیر مقدم کیا ۔ مولانا تعلیمی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ۔ اور نو قائم شدہ یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدہ پر مامور ہوئے ۔ انکا نوزائیدہ یونیورسٹی کے قیام کی تقریب میں جمال الدین افغانیؒ نے روشنگری پر ایک شاہکار تقریر کی ۔ تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا اس کو بنیاد بنا کر وہاں کے مشہور عالم دین ۔ جناب شیخ الاسلام حسن فہمی نے جو جمال الدین افغانیؒ کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے ، اپنی ذاتی مفاد کے لئے علامہؒ کی مخالفت شروع کردی ۔ اور انکے خیالات پر شدید تنقید کی اور انکی تقریر کا مطلب توڑ مروڑ کر پیش کیا ۔ اور ان پر الحادیت کو قطعی طور پر رد کرنے کا الزام لگایا ۔ اسی دوران سید عبدالغفور شہباز نے علامہؒ کے فارسی مضامین کو جمع کرکے "مقالات جمالیہ" کے نام سے ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد سے شائع کرایا ۔ نتیجہ کے طور پر جمال الدین افغانیؒ کو کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں انکو خفیہ پولیس کی کڑی نگرانی میں رکھا گیا ۔ جن کا تعلق بہت سے واقعات سے جو مصر میں واقع ہوئے تھے تھا ۔ جس میں خاص طور پر انقلاب اور ابی قابل ذکر ہے ۔ اور ابی مولانا کے شاگرد تھے ۔ مولانا نے اپنے کلکتہ کے قیام کے دوران متعدد تقاریر کیں ، جن میں انھوں نے مسلمانوں کو ان کے اپنے اندر کے مغرب زدہ لوگوں سے خبردار کیا ۔

جب ۱۸۸۲ء میں مصر میں اور ابی برطانیہ سے شکست کھا گئے اور اور ابی کو سری لنکا ملک بدر کردیا گیا تو جمال الدین افغانیؒ کو ہندوستان چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ۔ ان دنوں مولانا کے بھیجے بھی مضامین حیدرآباد سے شائع ہوتے ۔ ان میں ہندوستانیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ عوام متحد ہو کر

سامراج کا مقابلہ کریں اور سر سید احمد خانؒ جیسے مغرب پرست لوگوں سے خبردار رہیں۔ حالانکہ دونوں بزرگوں کی منزل ایک تھی مگر راہیں جدا جدا تھیں تاریخ کا فیصلہ یہی ہے۔ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے علامہ افغانیؒ نے افغانستان کا دورہ کیا۔ اپنی کتاب "تاریخ افغانستان" اپنے دوستوں میں تقسیم کی اور اس وقت کے افغانی حکمران امیر عبدالرحمٰن سے ملاقات کی اور ہندوستان واپس آئے۔ نومبر ۱۸۸۲ء میں ہندوستان سے "ایس ایس انڈیا" نامی جہاز سے یورپ اور امریکہ جانے کا ارادہ کیا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ آیا انہوں نے امریکہ کا دورہ کیا یا نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ واشنگٹن اور نیویارک گئے تھے اور امریکی دستور کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

یہ ایک بہت اہم بات ہے کہ چارلس گرین چین میں ایک سابق امریکی سفیر نے قصداً علامہؒ مرحوم کے مزار کی زیارت کی اور اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ مزار علامہ افغانیؒ جیسے عظیم رہنما اور خادم انسانیت کے شایان شان نہیں ہے۔ لہذا اس نے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروا دیا۔ چارلس گرین علامہؒ سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس عقیدت کے اظہار کے لئے چارلس گرین نے جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد افغانی عالم دین برہان الدین بلخی مقیم استنبول سے بھی ملاقات کی۔

امریکہ سے واپسی کے بعد جمال الدین افغانیؒ نے پیرس کو اپنا مرکز بنانے کی کوشش کی۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) فرانس مصر پر برطانیہ کے قبضہ سے خوش نہیں تھا۔

(۲) فرانس ٹیپو سلطان اور شاہ زمان ابدالی جیسے دوستوں کی ہلاکت اور ہندوستانی علاقوں میں برطانیہ سے شکست کی وجہ خوش نہیں تھا۔

(۳) چونکہ فرانس اور جرمنی ایشیا میں کوئی اثر نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے دونوں ممالک برطانیہ کے افریقہ میں روز افزوں اثرات سے خوف زدہ تھے۔

(۴) جرمنی کے شہزادہ بسمارک اور برطانوی وزیر اعظم گلیڈسٹون کے درمیان تعلقاتؑ اچھے نہیں تھے انہیں وجوہات کی بنا پر جمال الدین افغانیؒ نے پیرس کو برطانیہ کے خلاف جدوجہد کے لئے مناسب سمجھا۔

ایام پیرس،

۱۹ جنوری ۱۸۸۳ء روزنامہ "ابونظارہ زرقہ" مدیر جیمس صانوا۔

اہم خبر،

جمال الدین افغانیؒ خادم انسانیت مصری عوام کے بہی خواہ کا پیرس میں ورود ہوا۔ ۱۹ فروری کے اسی شمارے صفحہ اول پر جمال الدین افغانیؒ کی ایک تصویر کیساتھ ان کا ایک مضمون "الشرق والشرقیین" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۲۵ جنوری کو "البصیر" نامی روزنامہ جو "سورنامہ" خلیل غانم کی ادارت میں پیرس سے شائع ہوتا تھا۔ جمال الدین کی پیرس آمد کے بارے میں خبر شائع کی۔ جب مولاناؒ کی پیرس آمد کی خبر ان کے لائق تلامذہ محمد عبدہ، ادیب اسحٰق، اور ابراہیم لقانی تک پہنچی تو انہوں نے بیروت سے اپنے مرشد سے اظہار عقیدت کے لئے لمبے لمبے خطوط لکھے۔ بیروت میں تینوں ملک بدری کی زندگی گذار رہے تھے۔

محمد عبدہؒ فوراً ہی افغانیؒ سے آملے اور العروات "الوثوق" نامی اخبارات کی اشاعت شروع کردی۔ قیام پیرس کے دوران مولاناؒ کے تعلقات وکٹر ہوگو، ارنسٹ رینن، ہنری راکوٹو اور جارج کلیمنسو جیسے نامور لوگوں سے ہوگئے۔ ان میں اول الذکر ایک فلسفی ہیں۔ اور تین صحافی ہیں۔ علامہ مرحوم کے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہوتے تھے "العروات والوثوق" کے اٹھارہ شماروں میں سلسلے وار مولاناؒ کے مضامین شائع ہوئے۔ یہ شمارے مارچ تا اکتوبر ۱۸۸۴ء کے ہیں ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو جب مندرجہ بالا اخبار کا پروگرام شائع ہوا تو بڑے واضح انداز میں بتا دیا گیا تھا کہ یہ اخبار مسلمانوں کے مسائل اور ان کی نشاۃ ثانیہ کیلئے وقف ہوگا۔ اس میں مسلمانوں کو یہ بتایا جائے گا کہ وہ کس طرح اپنے مذہب کے زیر سایہ کھوئی عظمت حاصل کر سکیں گے۔

"العروات والوثوق" کے نوآبادیاتی مخالف نظریے اور مشرقی دنیا خاص کر مصر و ہندوستان میں اسکے اثرات اور سوڈان میں مہدی کی برطانیہ کے مقابلے میں کامیابی نے برطانیہ کو مجبور کردیا کہ ہندوستان اور مصر میں اسکا داخلہ ممنوع قرار دے۔ اور اسی کی وجہ سے اخبار کی اشاعت بند ہوگئی۔

درحقیقت اس اخبار کی اشاعت مشرقی عوام کی حق خود اختیاری اور سامراجی و نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کا ایک واضح اشارہ تھی۔ جاری ہے۔

شفیع اللہ خاں رازؔ الٰہ آبادی

غزلیں

ایم اے رشیمی دربھنگہ

جو لوگ محوِ خواب ہیں پتھر اچھال کے
ان کو جگا رہا ہوں گل تر اچھال کے
ہمدرد قاتلوں کی ادائیں تو دیکھئے
آنسو بہا رہے ہیں مرا سر اچھال کے
اب آئینوں کے دیس میں رہنا محال ہے
پتھر پکڑ رہے ہیں ستمگر اچھال کے
قسمت بنا رہی ہے فضاؤں میں زندگی
دیکھیں گے ہم بھی اپنا مقدر اچھال کے
کتنی نظر فریب بہاروں کی رات ہے
کانٹوں پہ سو رہا ہوں گل تر اچھال کے
یہ میکدے پہ کونسی افتاد آپڑی
ہر رند اشک بار ہے ساغر اچھال کے
پانی میں ان کا عکس نظر آ رہا ہے رازؔ
جو خشک ہو گئے ہیں سمندر اچھال کے

~~~~~~

بے ہنر، بے ادب، دل جلا رکھ دیا
نام تو نے یہ کیا کیا مرا رکھ دیا
میں نے ظالم تری دشمنی کے لئے
دل کا دروازہ اپنا کھلا رکھ دیا
آندھیوں سے کہو کر بجھا دے اسے
بیچ رستہ میں دل کا دیا رکھ دیا
بے وفا کون ہے خود ہی کر فیصلہ
روبرو اب ترے آئینہ رکھ دیا
سارے عالم کی خوشیاں تجھے سونپ کر
اپنے حصہ میں رنج و بلا رکھ دیا
تو نے رشمی کا جب سے دکھایا ہے دل
نام اس نے ترا بے وفا رکھ دیا

~~~~~~

غزلیں

محمد شہاب الدین ہمرازؔ دیتاسی

کچھ چاہتے تھے دیکھنا بزمِ سخن کو ہم
پژمردہ سی پاتے ہیں اس انجمن کو ہم
کس کو نہیں ہے یاد فسانہ کا رواں بھلا
آگے بڑھے تھے چوم کے دارو رسن کو ہم
کانٹوں کی جھاڑیوں میں بنایا تھا آشیاں
ٹھکرا کے آئے تھے رنگیں چمن کو ہم
ہم جانتے تھے کوچۂ جاناں کی وسعتیں
رنگیں بنایا اس نے اپنے کفن کو ہم
ہم کو تو اپنے عہدِ وفا کا خیال ہے
ہر چند جانتے ہیں ترے مکر و فن کو ہم
زیادہ نہ دیکھئے ہمیں الفاظ کے قریب
اچھی طرح سمجھتے ہیں طرزِ سخن کو ہم
معصومیت میں آئیں نہ یہ فتنہ گر کے ہاتھ
ہمرازؔ جانتے ہیں اس دورِ فتن کو ہم

ظہیر الدین ظہیرؔ نیم گانوی

نہ تلاش لالہ و گل مجھے نہ کسی کلی کی تلاش ہے
مرا دل ہے مائلِ جستجو مجھے آدمی کی تلاش ہے
جو امینِ حسنِ بہار تھا جسے پاس رنگِ حیا بھی تھا
مجھے اس چمن سے ہے واسطہ مجھے اس کلی کی تلاش ہے
جو شباب روح کی تیرگی جو دلوں کو نور عطا کرے
رہے دوستو مری بزم کو اسی روشنی کی تلاش ہے
مری راہ رو کے جہاں تو کیا مجھے کسی فکر نہیں ذرا
اسے دشمنی سے ہو کیا غرض جسے دوستی کی تلاش ہے
نہ ہو خندہ زن مرے حال پر مرے حوصلوں پہ ہو گر نظر
مجھے بزمِ جہلِ حریف میں رخِ آگہی کی تلاش ہے
یہ ظہیرؔ حال عجیب ہے نہ کوئی خلش نہ کوئی طلب
نہ مجھے الم کی ہے جستجو نہ مجھے خوشی کی تلاش ہے

انور سعد

میرٹھ میں صوبائی کانسٹبلری کے وحشیانہ مظالم

سینکڑوں مسلم نوجوانوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے ہلاک کیا گیا اور لاشیں نہر میں بہا دی گئیں

مسٹر ایل جیدی، بمبئی کے انگریزی روزنامہ انڈین پوسٹ کے خصوصی نامہ نگار ہیں وہ میرٹھ میں ہونے والے ہولناک واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ لکھتے ہیں: "میرٹھ کے اسلام نگر کی محمودہ بیگم نے اپنے چار بچوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ بلوائیوں نے پی۔ اے۔ سی کی موجودگی و نگرانی میں ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور پورے خاندان کو آگ کے حوالے کر دیا۔ گولیوں کی آوازوں میں ان کی چیخیں بہت دور تک سنی جا سکتی تھیں تین گھنٹے تک پی۔ اے۔ سی گولیاں چلاتی رہی۔

۲۲ مئی کا دن ہے آج ۴ دن بعد محمودہ کے جھونپڑے سے گھر کے چاروں طرف جلی ہوئی انسانی لاشوں کی ناقابل برداشت بدبو ہے۔ جھونپڑے سے کمرے میں جلی ہوئی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں۔ چند سو گز دور وہ بھی تقریباً جلی ہوئی ہیں۔ جن چارپائیوں پر لاشیں لائی گئی تھیں انھیں قریب کے تالاب میں پھینک دیا گیا کیونکہ ان میں سے نکلنے والی بدبو ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ قریب کے ایک کنویں سے ۱۰ دس لاشیں جو ایک ہی خاندان کے لوگوں کی ہیں گزشتہ دو دنوں میں نکالی گئی ہیں۔ ۵۰ لاشیں گنگا کنال سے اور ۱۵ لاشیں مراد نگر کے قریب ایک نہر سے برآمد کی گئی۔ ان مردہ جسموں پر گولیوں کے نشانات ہیں۔ ۵۰ مزید لاشیں گنگا نہر میں بہتی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔ ملیانہ کے پانچ گاؤں میٹھے کا موتی، اسلام نگر، ملتان نگر، گلشن پورہ اور ملیانہ سے تقریباً ۱۴۰ افراد غائب ہیں۔ ملیانہ کی گلیوں میں جلے ہوئے گھر، گھروں کی دیواروں پر گولیوں کے نشان اس وحشیانہ قتل عام کے ثبوت ہیں۔ ابھی تک چاروں طرف جلنے کی بو ہے۔ کئی سو عورتیں بچے اور بوڑھے جو سب ایک ہی فرقہ (مسلم) سے تعلق رکھتے ہیں، ایک شامیانہ کے نیچے ایک دوسرے سے چپکے ہوئے خوفزدہ سے بیٹھے ہیں۔

متاثرین نے اس نمائندے کو بتایا کہ قریبی گاؤں کے ایک فرقہ کے دو افراد فسادوں میں مارے گئے

تھے۔ اس پر ناراض ہو کر اس (ہندو) فرقہ کے لوگوں نے پی۔ اے۔ سی کی کمپنیوں کی مدد حاصل کر کے ملیانہ گاؤں کو گھیر لیا۔ ۲۳ مئی کو صبح ۹ بجے پی۔ اے۔ سی نے ہندوؤں میں سے چند لوگوں کے ساتھ شراب کی ایک دوکان کو لوٹ لیا، خوب شراب پی اور ۲ بجے کے قریب گاؤں کے ارد گرد پی۔ اے۔ سی کا گھیرا تنگ ہونا شروع ہو گیا۔ آٹے کی ایک چکی کے عیسائی مالک مسٹر ڈولکر اس نے بتایا کہ میں نے پہلے دھماکہ کی اور اس کے بعد مسلسل گولیوں کی آوازیں سنی۔ پی۔ اے۔ سی نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ٹرانسپورٹ نگر پولیس اسٹیشن کے سب انسپکٹر شیو لال آریہ اور آر سی سنگھ بھی اس وقت موجود تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد لوٹ مار شروع ہوئی جو دو گھنٹے تک جاری رہی ایک فرقہ (مسلمان) کے مکانوں میں کچھ نہیں بچا۔ جو چیزیں لوٹی نہ جا سکیں وہ جلا دی گئیں۔ تقریباً دس بجے بچے بوڑھے اور عورتیں ہاتھ اٹھا کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ محمد سلیم ایڈوکیٹ کا کہنا ہے ہم اس درندگی کو برداشت کرنے کے بجائے کو گلے لگانا بہتر سمجھتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے سینٹرل ریزرو پولیس فورس آئی اور باقی بچے ہوئے لوگوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ اس واقعہ کا عجیب پہلو یہ ہے کہ اکثریتی فرقہ ہندوؤں کے کسی گھر پر کوئی آنچ نہیں آئی یہاں تک کہ وہاں بھی جہاں دو ہندو مسلم گھروں کی دیواریں ملی ہوئی ہیں۔

ٹیلی گراف کلکتہ کا نمائندہ شنکر داس ملیانہ سے اپنے ۲۵ مئی کے مکتوب میں لکھتا ہے، پہلی نظر میں ملیانہ ایک مردہ شہر نظر آتا ہے۔ خالی سڑکیں، دوکانوں پر تالے، جلے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے مکانات جو اب بھی سلگ رہے ہیں، کہیں کہیں گلیوں میں گشت کرتا ہوا کوئی پولیس والا نظر آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرف خاموشی ہے۔ اگر کوئی آواز ہے تو گلی کے مرے ہوئے کتوں کی۔ ایک جگہ ادھ جلی ہوئی لاشوں کے ارد گرد دہشت زدہ بچے اور عورتیں جمع ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر چیختے چلاتے ہوئے ہماری طرف دوڑتے ہیں، تاکہ ہمیں اپنی داستان غم سنا سکیں۔ انہوں نے ہمارے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ انہوں نے ہماری نگاہوں کے سامنے ہمارے معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انہوں نے ہمارے زیورات لوٹ لئے۔ انہوں نے ہماری عورتوں سے دست درازی کی۔ انہوں نے ہمارے مردوں کو بے رحمی سے مارا۔ ہر شخص اپنی داستان سنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

۲۳ مئی کو دوپہر کے تین منحوس گھنٹوں میں ملیانہ کا پرامن قصبہ ایک قبرستان میں تبدیل ہو گیا۔ یہ کارنامہ (ایک بار پھر بدنام زمانہ پی۔ اے۔ سی نے سر انجام دیا۔ پی۔ اے۔ سی کے حوالے

نے چُن چُن کر گھروں کو لوٹا اور جلایا جب کہ ان میں سے کچھ جوان تھے مردوں، عورتوں اور بچوں کو مارنے اور گالیاں دینے میں مصروف تھے۔ اور جب وہ واپس لوٹے تو یہ واقعہ میرٹھ کے مستقل فسادات کا ایک بدترین باب بن چکا تھا۔

مقامی لوگوں کے مطابق لوٹ مار ۲۲ مئی کو تقریباً ۲ بجے دوپہر میں شروع ہوئی۔ پولیس نے گاؤں کے چاروں طرف مورچے سنبھال لیے اور لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا کہ وہ گاؤں کی صفائی کرنے والے ہیں ایک دکھیارے شخص نے جس کے خاندان کے افراد مارے گئے تھے بتایا۔ ہم نہیں سمجھ پائے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، کیونکہ یہاں نہ تو کوئی کشیدگی تھی اور نہ کوئی جھگڑا تھا۔ پی۔ اے۔ سی والوں نے تلاشی کے نام پر لوٹ مار کرنا اور گھروں کو جلانا شروع کر دیا۔ ایک بوڑھی عورت نے بتایا "ہم نے بہت منت سماجت کی لیکن ہماری کسی نے نہیں سنی وہ مارنے اور لوٹنے میں مصروف رہے۔ کچھ گاؤں والے قصبے کے اندرونی حصوں میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن وہ ہمارے پیچھے گالیاں بکتے ہوئے وہاں بھی گئے چھتوں پر چڑھ کر گولیاں برسانے لگے گھٹنوں اور بچوں تک کو نہیں بخشا۔ ۱۰ افراد کا ایک خاندان اتنا وحشت زدہ ہوا کہ اس نے اندر سے تالا لگا کر اجتماعی خودکشی کر لی۔ ان کی جلی ہوئی لاشیں اس وقت برآمد ہوئیں جب فوج نے گھر گھر کی تلاشی لی فوج کی آمد کے بعد ملیانہ والوں کو سانس لینے کی مہلت ملی یہ لوگ خود اپنے گاؤں میں پناہ گزیں ہو گئے اور کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔" وہ جن کے مکانات جلائے نہیں وہ بھی اپنے گھروں میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ معلوم نہیں کب کون ان پر حملہ کر دے۔ ایک گاؤں والے نے الزام لگایا کہ "گاؤں ہی کے کچھ لوگوں نے پی۔ اے۔ سی کا ساتھ دے کر اس درندگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

میرٹھ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل بی۔ ایس۔ کھرانہ نے قصبہ کا دورہ کیا اور حفاظتی انتظامات کو دیکھا۔ گاؤں کے داخلے کے ناکوں پر فوجی جوان بٹھا دیے گئے۔ فوجی جوان کھلم کھلا پی۔ اے۔ سی پر اس قتلِ عام کا الزام لگا رہے ہیں اور ان پر شدید نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا اور سنا کہ "ایسی سے لگتا ہے، وہ کہہ رہے تھے کہ پی۔ اے۔ سی نے جان بوجھ کر ایسا کیا"۔ ایک فوجی جوان نے اس شک کا اظہار کیا کہ یہ واقعہ کسی باقاعدہ منصوبے کا حصہ تھا۔ کیونکہ بہت سے مقامی لوگوں کو اس کی پہلے سے خبر تھی اور وہ صبح ہی اپنے خاندان والوں کو لے کر باہر نکل گئے تھے میرٹھ

کے دوسرے علاقوں کی طرح ملیانہ میں انتظامیہ کیلئے بھی بالکل واضح ہے۔ نہ تو طبی امداد اور نہ ضرورت کا دوسرا سامان یہاں پہنچا۔ ضلعی انتظامیہ سے ملیانہ کے بارے میں سوال کیجیے تو وہ اسے فائرنگ کا معمولی واقعہ کہہ کر جس میں چند افراد مارے گئے، نظرانداز کر دیتی ہے۔

روزنامہ اسٹیٹسمین کی رپورٹر شرمیلا سینا نے میرٹھ سے ۲۵ مئی کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ملیانہ کے لوگ بار بار کہہ رہے ہیں کہ پی۔ اے۔ سی نے اعلیٰ افسروں کی قیادت میں ان بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا۔ مردوں نے اپنی جان کی بھیک مانگی۔ روتی ہوئی عورتوں نے اپنے بچوں کو چھپا لیا لیکن کوئی رحم نہیں کیا گیا۔ "میں اس دن تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ جب تک پی۔ اے۔ سی والے جرائم کی قیمت وصول نہ کر لوں" سلیم اختر صدیقی نے جو مرنے والوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں کہا۔ اس کنویں سے زبردست بدبو آ رہی ہے جہاں سے فائر بریگیڈ والے لاشیں نکال رہے ہیں۔ یہاں ایک شخص کنویں کے قریب ایک مکان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جل کر راکھ ہو گیا ہے "اس میں محمد علی کا خاندان رہتا تھا۔ اس کا بیٹا ستار، دو بیٹیاں، بچے جو چھوٹے بیٹے یوسف کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے یہ سب مارے گئے۔ بچوں تک کو نہیں بخشا گیا۔ بعد میں یہ لاشیں کنویں میں پھینک دی گئیں ملیانہ اور اس کے آس پاس کل ۵ ہزار کی آبادی میں ۵ ہزار مسلمان ہیں۔ میرٹھ کی پوری تاریخ میں ملیانہ میں آج تک کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ اس بار بھی یہ بالکل پُرامن تھا لیکن پی۔ اے۔ سی نے باقاعدہ منصوبے کے تحت امن کو خاک میں ملا دیا۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ ایک سینئر پی۔ اے۔ سی افسر نے کہا تھا۔ "میں ملیانہ میں تمہیں جلیانوالہ باغ کا منظر دکھاؤں گا۔"

ہندی ہفت روزہ "چوتھی دنیا" کی رپورٹ میں بعض ایسے لرزہ خیز انکشافات کیے گئے ہیں جن سے رونگٹے بھی کانپ اٹھیں۔ لکھا ہے کہ "اتر پردیش پی۔ اے۔ سی کی ۴۱ ویں بٹالین کے کچھ نوجوانوں نے بعض فوجیوں کے ساتھ مل کر میرٹھ کے فساد زدہ علاقے کے ایک محلے کے قریب چالیس افراد کو اپنے ٹرک میں لاکر غازی آباد علاقے کی دو نہروں کی پٹریوں پر کھڑا کر کے سامنے سے گولی مار کر قتل کر دیا اور اب اس سرکاری گناہ کو چھپانے کے لیے اعلیٰ افسر تک ہی نہیں وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ بھی سرگرمِ عمل ہیں۔ "چوتھی دنیا" کے نامہ نگار کی کئی روز کی محنت کے بعد یہ سنسنی خیز حقیقت سامنے آئی کہ یہ لرزہ خیز اور بہیمانہ قتلِ عام گذشتہ ۲۲ مئی کو رات میں کیا گیا۔ باوردی جوانوں کی

ایک چھوٹی سی غلطی نے ان کے پاپ کا گھڑا پھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کو مردہ سمجھ کر وہ چھوڑ گئے تھے ان میں سے بعض لوگ زندہ بچ گئے اور اب سخت سرکاری حفاظت میں علاج ہو رہا ہے۔ غازی آباد کے دو تھانوں میں ان زخمیوں کی جانب سے پی اے سی کے نامعلوم جوانوں اور حکام کے خلاف اس قتل عام کی ایف آئی آر درج ہے۔ پورا واقعہ اس طرح ہے۔

گذشتہ ۲۲ مئی کو کرفیو زدہ سورج کنڈ علاقے کے ہاشم پورہ محلے میں دن کے دو بجے پی اے سی کے پانچ چھ ٹرک پہنچے ساتھ ہی کچھ ٹرکوں میں فوجی جوان بھی تھے، یہاں کے مسلمان خاندانوں کی تلاشی شروع ہوئی کوئی چار بجے تک محلے کے چار سو سے زیادہ لوگوں کو ہانک کر مین روڈ پر بٹھا دیا گیا پھر فوج اور پی اے سی کے حکام کے درمیان کوئی سرگوشی ہوئی۔ اس کے بعد عورتوں اور بچوں، اور بوڑھوں کو علیحدہ کر دیا گیا اور جوانوں میں سے تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو پی اے سی کے چار ٹرکوں میں یہ کہہ کر بھر لیا گیا کہ پوچھ گچھ کے لئے کوتوالی لے جایا جا رہا ہے۔ باقی لوگوں کو گھر واپس بھیج دیا گیا۔

ہاشم پورہ سے چل کر فوجی چھاؤنی تھانے کے پاس ٹھہر گئے۔ بعد میں ان میں سے ایک ٹرک شام ساڑھے سات بجے دلی روڈ پر غازی آباد کی سمت چلا۔ اس ٹرک میں پلاٹون کمانڈر سریندر سنگھ کے ساتھ پی اے سی کے آٹھ جوان اور پانچ فوجی تھے، یہ ٹرک بہت تیز رفتاری سے چلکر مودی نگر کے آگے مراد نگر قصبے کے کنارے سے بہنے والی گنگا نہر کے پل پر رکا۔ یہاں پر تھوڑی دیر رکنے کے بعد اس ٹرک کو مین روڈ سے آدھا کلو میٹر دور آبپور گاؤں کی طرف نہر کی پٹری پر لے جایا گیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ پٹری پر آم کے پیڑ کے پاس کھجور کی جھاڑی ہیں۔ یہیں ٹرک میں بھرے دو درجن نوجوانوں کو کھڑا کر کے سامنے سے گولی ماری گئی اور ان کی لاشیں نہر میں پھینک دی گئیں۔ ٹرک میں باقی رہ جانے والے نوجوانوں نے جب اپنے ساتھیوں کا یہ حال دیکھا تو وہ ان شیطانوں سے جان کی بھیک مانگنے لگے لیکن انہیں بری طرح مارا پیٹا گیا۔ اس کے بعد وردی پوش پھر ٹرک میں سوار ہوئے اور یہ ٹرک تیز رفتاری سے دوبارہ چلا تقریباً ساڑھے نو بجے تھانہ لنک روڈ غازی آباد کے مکن پور گاؤں کے پاس ہنڈن نہر کے پل کے پاس باقی تمام نوجوانوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی ماری گئی اور جہاں یہ واقعہ ہوا، اس جگہ سے پی اے سی کی ۴۱ ویں

بٹالین کے کیمپ کا فاصلہ آدھا کلو میٹر بھی نہیں ہے پی اے سی کے یہ منتقم مزاج وردی پوش بٹالین کے کیمپ میں خون آلود ٹرک کو صاف کرنے کے بعد فوراً میرٹھ بھاگ گئے جہاں ان کی ڈیوٹی لگی تھی۔

مکن پور کے پاس جب یہ قتل عام ہوا تو پاس کے کھیتوں والے کچھ لوگ گولیوں کی آوازوں کی سمت میں دوڑے اس وقت تک مکن پور گاؤں کے کچھ لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ پانی میں پندرہ سولہ لاشیں پڑی ہیں جب یہ لوگ پاس گئے تو ایک زخمی شخص مدد کے لئے پکارنے لگا۔ ذرا دیر میں اس حادثے کی اطلاع ایک کلو میٹر دور واقع تھانہ لنک روڈ کے پولیس والوں کو ملی۔ انہیں جب حقیقت کا علم ہوا تو وہ کشمکش میں پڑ گئے، رات گیارہ بجے غازی آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نسیم زیدی تھا اور ایس ایس پی وبھوتی رائے کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو یہ لوگ فوراً موقع پر پہنچے ان لوگوں نے دیکھا کہ لاشوں کے درمیان تین اشخاص زندہ ہیں، ان کو نہر سے باہر نکالا گیا۔ گولی سے زخمی تینوں افراد کو غازی آباد کے نرہندر موہن اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ ان میں سے ایک اسپتال پہنچتے ہی چل بسا۔ دو زندہ رہے۔ زندہ بچ جانے والوں میں ایک بابودین ہے جس نے ان دونوں حکام کے سامنے یہ لرزہ خیز روئداد سنائی۔ بابودین کی اطلاع پر حکام نے مراد نگر تھانے کی پولیس کو واقعہ کی تفتیش کا حکم دیا۔ ایک گھنٹہ بعد ہی مراد نگر پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مطلع کیا کہ لاشیں تو بہہ گئی ہیں لیکن انہیں ایک زخمی مل گیا ہے جو نہر کا کنارہ پکڑے ہوئے لٹکا ہوا تھا یہ زخمی مجیب الرحمن ہے اطلاع ملتے ہی مجیب الرحمن کو فوراً موہن نگر اسپتال لایا گیا۔ مجیب الرحمن نے بھی پورا واقعہ بیان کیا اس نے بھی بتایا کہ اس کے علاوہ دو افراد اور بچ کر بھاگ گئے ہیں۔ مجیب الرحمن نے کہا کہ اسے کچھ نہیں معلوم کہ لوگوں سے بھرے باقی تین ٹرک کہاں گئے ان میں سوار نوجوانوں کا کیا حشر ہوا، مجیب الرحمن نے بتایا کہ وہ سب لوگ ہاشم پورہ کے ہیں اور بہاری مسلمان ہیں میرٹھ کے ٹیکسٹائل پرنٹنگ کے کاروبار میں مزدور تھے۔ ان زخمیوں کے بیان کی بنیاد پر ۲۲ ر ۲۳ اور ۲۴ مئی کی درمیانی رات کو تھانہ مراد نگر میں مجیب الرحمن کی جانب سے اور اسی رات تھانہ لنک روڈ میں بابودین کی جانب سے پولیس نے تعزیرات ہند کی دفعات ۳۰۲، ۳۰۷، ۳۶۴ اور ۲۰۱ کے تحت نامعلوم پی اے سی والوں اور فوجیوں کے خلاف ایف آئی آر درج کی۔ ایف آئی آر درج ہونے کے بعد میرٹھ کے ڈائرکٹر جنرل پولیس دیا شنکر بھٹناگر کو یہ اطلاع دی گئی، یہ اطلاع ملتے ہی بھٹناگر رات ہی کو غازی آباد گئے صبح چار بجے

یو پی ہاؤس دہلی میں قیام پذیر وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کو جگایا گیا۔ اور اس واقعہ کی اطلاع دی گئی
اطلاع ملتے ہی ویر بہادر سنگھ غازی آباد آئے انہوں نے افسران کو دھمکی آمیز لب و لہجہ میں حکم دیا کہ معاملے
کی بھنک کسی کو نہیں لگنی چاہئے۔ ایف آئی آر درج کرنے کی غلطی پر بھی انہوں نے ناراضگی ظاہر کی۔
چنانچہ اس وقت سے انتظامیہ اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

معتبر ذرائع کے مطابق ۲۲ مئی کو شام انٹیلی جنس نے اس سرکاری قتل عام کی اطلاع وزیر اعظم
کی رہائش گاہ تک پہنچائی تو اگلے دن یعنی ۲۳ مئی کو "دربار" میں وزیر اعلیٰ کی پیشی ہوئی۔ اس دن سے
وزیر اعظم ہاؤس کے حکم پر زخمیوں کو سخت نگرانی میں رکھا جانے لگا۔ ایک اعلیٰ افسر کی نگرانی میں
سنٹرل ریزرو پولیس نریندر موہن اسپتال میں زخمیوں کے کمرے کے باہر تعینات ہے۔ زخمی بابو دین اور
مجیب الرحمٰن اس اسپتال کے سرجیکل وارڈ نمبر ۱۰ اے میں داخل ہیں۔ دونوں کی حالت تشویشناک ہے
دونوں کو کئی گولیاں لگی ہیں۔ اس نامہ نگار نے کئی بار ان زخمیوں سے ملنے کی کوشش کی لیکن سنٹرل
ریزرو پولیس نے اس کی اجازت نہیں دی۔

۲۸ مئی کو دوپہر میں یہ نامہ نگار زخمیوں کے کمرے میں گھس جانے میں ضرور کامیاب ہو گیا لیکن
اس سے پہلے کہ ان سے کوئی بات ہوتی ایک وردی پوش نے اس نامہ نگار کو دبوچ لیا اور زبردستی کمرے سے
باہر نکال دیا۔ بابو دین کے ساتھ زخمی ہونے والا دوسرا شخص محمد عثمان ہے جسے دہلی آل انڈیا انسٹی
ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں داخل کرایا گیا ہے ان زخمیوں کا علاج وزیر اعظم کی ہدایت پر ہو رہا ہے۔
زخمیوں سے غازی آباد کے ضلع مجسٹریٹ کے علاوہ کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے زخمیوں نے اس قتل
کے بارے میں جو بیانات دیئے ہیں اس کی اطلاع اس نامہ نگار کو انتہائی معتبر ذرائع سے مل گئی ساتھ
ہی تفصیلات ملنے پر نامہ نگار نے مکن پور میں ہنڈن نہر کے پاس وہ جگہ دیکھی جہاں پر قتل عام ہوا تھا
نامہ نگار کو یہاں کے دو چرواہوں نے بہت کچھ بتایا لیکن وہ ڈر اور خوف کے باعث اپنا نام خفیہ
رکھنا چاہتے ہیں۔ گنگا نہر کے کنارے سے آباد پور گاؤں کے آس پاس بھی اس نامہ نگار نے تحقیقات کی
یہاں بھی پولیس کی دہشت ہے۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ پولیس والے کہہ گئے ہیں کہ اگر کسی نے کسی کو
بتایا کہ ہم نے گولیوں کی آواز سنی تھی تو اسے بخشا نہیں جائے گا۔ ایک نوجوان من سنگھ نے بتایا کہ
جب گولی چل رہی تھی تب وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ گاؤں کے ایک بوڑھے عبدالحمید نے کہا کہ ہماری زبان

پر تالے ہیں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

کئی لوگوں نے بتایا کہ پورے گاؤں نے اس دن گولیوں کی آواز سنی تھی کچھ لوگ رات میں
اس جگہ بھی گئے تھے لیکن اندھیرا ہونے دیکھ کر چپ چاپ لوٹ آئے گاؤں والوں نے ہمیں وہ جگہ دکھائی
جہاں کھڑا کر کے لوگوں کو گولی ماری گئی تھی۔ پتہ چلا ہے کہ یہاں کئی دنوں تک خون پڑا رہا لیکن ۲۵ مئی
کو میرٹھ کی طرف سے پی اے سی کے ٹرک پر آنے والے لوگوں نے رات کے وقت اسی جگہ کھجور کی جھاڑیوں
میں آگ لگا دی۔ اس سے کچھ آم سے لدا ایک پیڑ بھی آدھا جھلس گیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ وہاں خون
کے داغ سیاہی میں بدل گئے ہیں۔ یہاں کی جلی ہوئی جھاڑیاں جرم چھپانے کی کوشش کی گواہ ہیں۔

یہ قتل عام کیوں ہوا؟ اس کے بارے میں نامہ نگار نے تحقیقات کی تو قتل عام کی وجہ بھی سامنے
آ گئی۔ ہوا یہ کہ ۱۹ مئی مسلم اکثریتی علاقے سے ہاشم پورہ کی ایک گلی سے گولی چلی جس سے سورج کنڈ
کے ایک نوجوان پربھات کوشک (عمر ۲۳ سال) کی موت واقع ہو گئی۔ پربھات شہر کا بااثر شہری اور
بھارتیہ جنتا پارٹی کے ریاستی یونٹ کے سکریٹری شکنتلا کوشک کا بھانجا تھا۔ پربھات کا ایک بھائی
ششی چندر میرٹھ چھاؤنی میں فوج میں میجر کے عہدے پر ہے۔ جب اسے بھائی کی موت کی اطلاع ملی
تو وہ جھنجھلا گیا یہاں تک کہ ۲۲ مئی کو میڈیکل کالج میں پوسٹ مارٹم کے لئے رکھی ہوئی پربھات کی نعش
کو بغیر پوسٹ مارٹم کے ہی لے آیا۔

اس کے ساتھ کئی فوجی بھی تھے۔ اس شام جب مسلم نوجوانوں کو ٹرکوں میں بھرا گیا تو لوگوں نے
میجر ستیش چندر کو بھی وہاں دیکھا جس سے اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس میجر کی اسکیم پر ہی یہ قتل عام
کیا گیا۔ نامہ نگار کو ہاشم پورہ کے کئی لوگوں نے بتایا کہ اسی دن لے جائے گئے ڈیڑھ سو جوانوں میں ابھی
تک کوئی بھی واپس نہیں آیا ہے۔ لاشوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ زخم
جن ہتھیاروں کے ہیں وہ سیکورٹی فورسز کے پاس ہی ہوتے ہیں۔

"مضامین خوشخط اور صفحہ کے ایک ہی طرف
لکھ کر روانہ کریں۔"

از عبداللطیف الطیباوی — ترجمہ: محمد عارف عمری اعظمی

بیت المقدس کے قدیم اسلامی مدارس

یوں تو اسلامی تعلیم و تربیت ہی نہیں بلکہ اسلامی ثقافت و تمدن کی مکمل تاریخ علوم و فنون کی تاریخ ہے۔ لیکن فاطمیوں اور عباسیوں کی باہمی سیاسی کشمکش اور مذہب و فکر کی رسہ کشی نے فن تعلیم و تربیت کو مستقل فن اور موضوع کی حیثیت بخشی۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں فاطمیوں کی جانب سے دار العلم اور پانچویں صدی ہجری میں بنو عباس کی طرف سے المدرسہ کا قیام عمل میں آیا (۱)۔

سرزمین بیت المقدس پر سب سے پہلے فاطمیوں نے دار العلم قائم کیا، جو سنہ ۴۹۲ھ میں صلیبیوں کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا۔ سنہ ۵۸۳ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کی فتح کے بعد المدرسہ کی بنیاد رکھی، یہ مدرسہ سلطان ہی کی جانب منسوب ہو کر مدرسہ صلاحیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مدرسہ صلاحیہ کے بعد بیت المقدس میں اسلامی مدارس کا ایک وسیع سلسلہ چل پڑا۔

بیت المقدس میں واقع اسلامی مدارس کی تاریخ پر سب سے جامع اور مبسوط کتاب "کتاب الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل" ہے جو دسویں صدی کے ایک قدیم قاضی عبدالرحمان بن محمد مجیر الحنبلی کی تصنیف ہے (۲)، شہر القدس کے کار پردازوں کے ایک عربی النسل میر نے بھی تاریخ بیت المقدس پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں قدیم اسلامی مدارس کا مفصل تذکرہ ہے، عمارتوں پر کندہ نقوش و آثار اور شرعی عدالتوں کے قدیم ریکارڈ کی روشنی میں مدارس کی تاریخ تاسیس، بانیان ادارہ کے حالات زندگی، اساتذہ و معلمین کی لیاقت و صلاحیت اور طلبہ کے احوال و کوائف کی بابت کافی معلوماتی مواد اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔

بیت المقدس کے تقریباً تمام مدارس حرم اقصیٰ کے مغرب یا شمال میں واقع تھے، ان کی عمارتیں خاص

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو معارف شمارہ اگست سنہ ۱۹۸۰ء "اسلامی تاریخ میں فن تعلیم و تربیت کے ارتقائی مراحل"

(۲) اس کتاب کے متعلق مزید معلومات کیلئے دیکھئے "معاہد العلم فی بیت المقدس" مؤلفہ ڈاکٹر عبد الجلیل۔

طور پر مدرسہ جو مملوکی عہد میں تعمیر ہوئی تھیں فن معماری کا عمدہ نمونہ اور خوبصورتی و رعنائی کی اعلیٰ شاہکار تھیں، چھوٹے مدرسوں کی عمارتیں ایک درس خانہ اور دو کمروں پر مشتمل ہوا کرتی تھیں اور بڑے مدرسوں میں دو دو دیوان خانے، جن کے اطراف کمرے اور چار کمرے، ایک مسجد اور طہارت خانے ہوا کرتے تھے۔ بعض مدارس میں اساتذہ کی رہائش کے لئے مکانات اور طلبہ کے لئے دار الاقامے بھی ہوا کرتے تھے۔

سرزمین بیت المقدس پر ایوبیوں نے ۵۸۳ھ سے ۹۲۲ھ تک ۹۰ سال حکمرانی کی ہے اور بیشمار مدرسے تعمیر کروائے ہیں چند اہم مدرسے یہ ہیں۔

۱ — مدرسہ صلاحیہ۔ یہ مدرسہ صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کی فتح کے بعد شافعی مسلک کے فقہاء کے لئے تعمیر کروایا تھا، شہر کے اطراف و جوانب میں کافی جایداد اس پر وقف کی قاضی بہاء الدین بن شداد کو اس کی نظامت اور صدر مدرسی کا عہدہ سپرد کی۔ مدرسہ کے اوقاف کا رجسٹر ۹۱۸ھ میں ہوا۔ ابو الفداء کی ایک روایت یہ ہے کہ مدرسہ صلاحیہ ٹھیک اسی جگہ واقع تھا جہاں فاطمیوں کا دار العلم تھا (۱)، لیکن ہمارے خیال میں دار العلم شہر کی مشرقی فصیل سے متصل ستنا مریم نامی گرجے کے اندرونی حصہ میں ایک قبہ نما تراشی ہوئی چٹان پر واقع ایک کلیسہ کی عمارت میں قائم کیا گیا تھا، جس کے قریب راہبات کی رہائش کے لئے ایک قیام گاہ تھی۔ مدرسہ صلاحیہ کلیسہ کی عمارت کے بجائے راہبات کی رہائش گاہ میں واقع تھا، اور کلیسہ بیت المقدس کی فتح کے بعد شہر کے مشرقی حصہ کی رہائش پذیر بعض لاطینی عیسائیوں کی تحویل میں دیدیا گیا تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی ادوار میں بھی صدیوں تک عیسائی زائرین اس کلیسہ کی زیارت کے لئے آتے رہے۔

مدرسہ صلاحیہ کو مملوکی عہد اقتدار میں کافی مقبولیت اور ترقی حاصل ہوئی، اس کے صدر مدرس کا تقرر شاہی فرمان سے ہوا کرتا تھا، اس کا صدر مدرس قاضی قضاۃ الشافعیہ کے لقب سے ملقب ہوتا تھا اور بیت المقدس کے نائب حکمران اور حرم اقصیٰ اور مسجد ابراہیم کے نگران کے منصب پر بھی فائز ہوتا تھا، وہی مدرسہ کا ناظم بھی ہوتا تھا۔

گو اس مدرسہ کا قیام شافعی مسلک کی تعلیم کے لئے عمل میں آیا تھا، تاہم جوں جوں اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اس میں شافعی مسلک کے ساتھ دیگر مسلک کے طلبہ اور فقہاء بھی تدریسی فرائض انجام دینے لگے، اس مدرسہ میں تعلیم و تربیت کے لئے انتہائی باصلاحیت اور مستند علماء کا انتخاب کیا جاتا تھا۔

---

(۱) المختصر فی اخبار البشر ابو الفداء [illegible] جلد ۳ ص [illegible]

بیت المقدس کے حکمراں اس مدرسہ کے اساتذہ کا احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوبی عہد کے امراء و سلاطین کی سوانح اور ان کے حالات زندگی میں مدرسہ صلاحیہ کے اساتذہ کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔

۲۔ مدرسہ افضلیہ:۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ولیعہد صاحبزادے سلطان الافضل نورالدین ابوالحسن علی نے اپنے والد کی موجودگی ہی میں ۵۸۹ھ میں اس مدرسہ کو تعمیر کروایا تھا۔ سلطان ابوالحسن ان دنوں دمشق کے وائسرائے تھے اور بیت المقدس شام کا ایک صوبہ تھا۔

یہ مدرسہ مسجد اقصیٰ کی مغربی چہار دیواری سے متصل "حی المغاربہ" میں واقع ہے۔ حی المغاربہ اسلامی تاریخ میں نہایت ہی اہمیت کا حامل اور بابرکت محلہ ہے، واقعہ اسراء و معراج کا اس مقام سے بہت گہرا ربط و تعلق ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات صخرہ مبارکہ کے پاس دعا کے لئے تشریف لے جانے سے پہلے اسی مقام پر اپنے براق کو ٹھہرایا تھا اور اسی کے پاس انبیاء کرام کی امامت فرمائی تھی۔

۳۔ مدرسہ میمونیہ:۔ یہ ایک مختصر سا مدرسہ تھا، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے وزیر خزانہ امیر فارس الدین ابوسعید میمون بن عبداللہ القصری نے ۵۹۳ھ میں شافعی مسلک کے مقلدین کے لئے تعمیر کروایا تھا، شہر کی شمالی فصیل کے داخلی حصہ میں "باب الساھرۃ" کے قریب واقع تھا۔

۴۔ مدرسہ جراحیہ:۔ یہ مدرسہ بھی مختصر تھا۔ فصیل کے خارجی حصہ میں نابلس کی طرف جانے والی شاہراہ پر "باب العامود" کے شمالی جانب واقع تھا، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی فوج کے ایک اہم سپہ سالار امیر حسام الدین الحسین شرف الدین عیسیٰ الجراحی اس کے بانی ہیں، ان کا ۵۹۸ھ میں وصال ہوا اسی مدرسے میں دفن کئے گئے۔

۵۔ مدرسہ نصیریہ:۔ اس کا دوسرا نام غزالیہ بھی تھا، یہ مدرسہ سرزمین بیت المقدس پر صلیبیوں کے قبضہ و استبداد سے قبل ہی قائم ہو چکا تھا۔ حرم اقصیٰ کے مشرق میں "باب الرحمۃ" اور "باب التوبہ" کی بالائی سطح پر ایک برج میں واقع تھا۔ اس میں ابوالفتح نصر بن ابراہیم المقدسی مقیم تھے انہیں کی جانب منسوب ہو کر یہ مدرسہ نصیریہ کے نام سے مشہور تھا۔ پھر اس میں ان کے شاگرد ابوحامد غزالی سکونت پذیر ہوئے۔ اسی کے بعد سے یہ مدرسہ غزالیہ بھی کہا جانے لگا۔

صلیبیوں کے قبضہ کے بعد یہ مدرسہ معطل اور ویران کر دیا گیا، ۵۸۳ھ میں سلطان

صلاح الدین ایوبیؒ کے بھائی شرف الدین عیسیٰ نے اسکو زندہ کیا۔ اس میں قرآن مجید اور نحو کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔

۶۔ مدرسہ نحویہ:۔ سلطان عیسیٰ نے ۶۰۴ھ میں مسجد صخرہ کے جنوبی صحن میں واقع ایک جدید عمارت میں اسکا سنگ بنیاد رکھا۔ اور حنفی مسلک کے متبعین کے لئے اس کو وقف کیا۔ اس میں بھی قرآن مجید اور سیبویہ کی "الکتاب" پڑھائی جاتی تھی۔

۷۔ مدرسہ معظمیہ:۔ حرم اقصیٰ کے شمال میں باب شرف الانبیاء کے پاس یہ مدرسہ تھا، اس کو بھی سلطان عیسیٰ نے حنفی فقہاء کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ لیکن ۹۶۰ھ سے پہلے ہی یہ مدرسہ ختم ہو گیا۔

مملوکیوں کے ڈھائی سو سالہ عہد حکومت میں بھی سرزمین بیت المقدس میں کافی مدارس قائم کئے گئے۔ اس عہد کے بعض مشہور مدرسے یہ ہیں۔

۱۔ خانقاہ دواداریہ:۔ یہ مدرسہ امیر علم الدین ابو موسیٰ سنجر بن عبداللہ الصالحی نے ۶۹۵ھ میں صوفیہ کے لئے تعمیر کروایا تھا، یہ حرم اقصیٰ کے شمال میں "باب شرف الانبیاء" کے قریب واقع تھا، امیر سنجر کے والد عبداللہ الدوادار وزیر قلمدان تھے اور شاہی فرامین پر دستخط ثبت کیا کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں قرآن مجید اور حدیث نبویؐ کے ساتھ فقہ شافعی کی تعلیم لازمی تھی۔

۲۔ مدرسہ جاولیہ:۔ غزہ کے نائب حکمراں امیر علم الدین سنجر جاولی (متوفی ۷۴۵ھ) نے یہ مدرسہ حرم اقصیٰ کی شمالی اور مغربی چہار دیواری کے قریب "باب غوانمہ" کے اندرونی حصہ میں تعمیر کروایا تھا، لیکن یہ مدرسہ صرف ایک ہی صدی تک باقی رہا۔ پھر اس کی عمارت شاہی نیابت خانہ بنا دی گئی۔

۳۔ مدرسہ تنکزیہ:۔ شام کے نائب حکمراں امیر سیف الدین تنکز الناصری نے ۷۲۹ھ میں حرم اقصیٰ کے مغرب میں واقع "باب السلسلہ" کے بیرونی حصے میں اس کو تعمیر کروایا تھا۔ مجیر الدین الحنبلی کہتے ہیں کہ "اس کی عمارت بیت المقدس کی تمام درسگاہوں کی عمارتوں میں سب سے زیادہ ٹھوس اور پائیدار تھی"۔ مشہور کتاب "مثیر الغرام بفضائل القدس والشام" مصنف جمال الدین ابومحمود احمد بن ہلال المقدسی اس مدرسہ میں استاذ تھے۔

۴۔ مدرسہ فخریہ:۔ ایک قبطی نومسلم قاضی فخر الدین ابو عبداللہ محمد بن فضل اللہ نے جو کہ اسلامی فوجوں کے نگران اعلیٰ تھے مسجد اقصیٰ کے قریب ہی حی المغاربہ کے ابتدائی حصہ میں اس کو تعمیر کروایا تھا۔

عثمانی حکومت کے ابتدائی ایام میں یہ مدرسہ حنفا و فقراء کا مرکز تھا، ۱۹۶۷ء میں یہودیوں کے ہاتھوں حی المغاربہ کی تمام عمارتوں کے ساتھ یہ بھی زمین بوس کر دیا گیا۔

۵۔ مدرسہ فارسیہ:۔ یہ مدرسہ امیر فارس البکی بن امیر قطلو بن عبداللہ نے جو کہ غزہ کے ساتھ اس کے اطراف و جوانب کے ساحلی اور کوہستانی علاقوں کے بھی نائب حکمران تھے ۷۵۵ھ میں باب شرف الانبیاء کے پاس تعمیر کروایا تھا۔ انھوں نے مشہور شہر طولکرم[1] کا ایک وسیع علاقہ اس پر وقف کیا تھا۔

۶۔ مدرسہ ارغونیہ:۔ شام کے نائب حکمران امیر ارغون کاملی نے ۷۵۸ھ میں ایک مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا، لیکن اس کی عمارتوں کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال کر گئے، امیر رکن الدین بیبرس نے ۷۵۹ھ میں اس کی تکمیل کروائی۔ یہ مدرسہ حرم اقصیٰ کے مغربی صحن میں واقع باب حدید کے قریب تھا، باب حدید کو باب ارغون بھی کہا جاتا ہے، ترکی میں لفظ ارغون، عربی کے لفظ "حدید" کے ہم معنی ہے، دونوں ہی لوہے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

۷۔ مدرسہ منجکیہ:۔ شام کے نائب حکمران امیر سیف الدین منجک نے حرم اقصیٰ کے مغربی جانب باب الناظر جس کو باب علاء الدین بھی کہا جاتا ہے سے متصل ۷۶۲ھ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی، عام خیال یہ ہے کہ سلطان ناصر نے انہیں یہ مدرسہ تعمیر کروانے کے لئے بیت المقدس بھیجا تھا، لیکن اس مدرسہ کی عمارتوں کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی امیر سیف الدین معزول کر دیئے گئے۔ چنانچہ سلطان ناصر نے خود ان عمارتوں کو بنوا کر اس کو مکمل کیا۔ لیکن اس کو اپنے نام سے موسوم کرنے کے بجائے امیر سیف الدین ہی کی جانب اس کی نسبت کی۔ اس مدرسہ کے لئے کافی جائیداد و اراضی وقف کئے، خود مہتمم و صدر مدرس کا تقرر کیا، بیت المقدس کے قاضی اس میں درس دیا کرتے تھے۔

---

[1] یہ شہر اب طولکرم کے نام سے مشہور ہے۔

۸۔ مدرسہ خاتونیہ:۔ شمس الدین محمد سیف الدین قازانی کی دختر اغل خاتون نے ۷۵۵ھ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی، پھر ۷۸۲ھ میں امیر قازان شاہ کی صاحبزادی اصفہان شاہ نے اس کو مزید وسعت دی، اور اس کے اوقاف میں کافی اضافہ کیا۔ یہ مدرسہ باب حدید کے مغربی اور جنوبی سمت میں واقع تھا۔

۹۔ مدرسہ باسطیہ:۔ یہ مدرسہ باب شرف الانبیاء کے شمال میں واقع تھا، مدرسہ صلاحیہ کے ایک صدر مدرس محمد الہروی نے اس کا خاکہ مرتب کیا، لیکن قضاء اجل نے عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ دیا، ان کی وفات کے بعد منصورہ کی افواج کے نگران اعلیٰ قاضی زین الدین عبدالباسط دمشقی نے یہ مدرسہ تعمیر کیا۔

۱۰۔ مدرسہ قادریہ:۔ یہ مدرسہ سلطان اشرف برسبائی کے عہد حکومت ۸۳۶ھ میں قائم کیا گیا تھا، امیر ناصر الدین محمد بن ذلغادر کی اہلیہ مصر خاتون نے حرم اقصیٰ کے شمال میں باب حطہ کے قریب اس کی بنیاد رکھی، حرم اقصیٰ کے مغرب میں باب القطانین کے قریب ایک سرائے اور کئی ایک دوکانیں اس مدرسہ پر وقف کیں۔

۱۱۔ مدرسہ عثمانیہ:۔ ایک رومی النسل خاتون اصفہان شاہ خاتون نے ۸۴۰ھ میں باب القطانین کے قریب حرم اقصیٰ کی ایک راہداری میں اس کو تعمیر کروایا تھا، اور اس پر کافی اراضی وقف کی تھی۔ اس مدرسہ کے مشہور استاذ سراج الدین بن زکریا بن یوسف رومی اناضولی گذرے ہیں جو حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور علوم معقولات خاص طور پر فن تفسیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ اس مدرسہ کے صدر مدرس بھی بنائے گئے تھے، مگر جب انھیں مدرسہ کی بانیہ کی اس شرط کا علم ہوا کہ اس مدرسہ کی مسند صدارت پر وہی شخص متمکن ہوگا جو علم و فضل میں اپنے تمام معاصر علماء پر فوقیت رکھتا ہو، تو انہوں نے اس عہدے سے علیحدگی اختیار کر لی اور یہ کہا کہ میں اس صفت کا مالک نہیں۔

۱۲۔ مدرسہ جوہریہ:۔ امیر جوہر القنقبائی الخازندار و وزیر خزانہ نے ۸۴۴ھ میں باب حدید کے قریب اس مدرسہ کو تعمیر کروایا تھا۔ اس مدرسہ کے مشہور استاذ کمال الدین ابو المعالی محمد بن ابی شریف المقدسی گذرے ہیں۔ یہ کتاب الانس الجلیل کے مصنف مجیر الدین علیمی کے استاذ تھے۔

۱۳۔ مدرسہ اشرفیہ:۔ یہ مدرسہ دو مرتبہ تعمیر کیا گیا تھا، پہلی عمارت منہدم ہو گئی

تھی۔ ۸۸۷ھ میں سلطان اشرف قائتبائی نے بیت المقدس کا دورہ کیا اور اس کو دوبارہ تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس کی عمارت بہت خوبصورت، پائیدار اور خوشنما تھی۔ مجیرالدین علیمی لکھتے ہیں:

"مسجد اقصیٰ اور قبہ صخرہ کے بعد بیت المقدس کا یہ تیسرا اعزاز تھا۔"

یہ مدرسہ حرم اقصیٰ کے داخلی حصہ میں باب القطانین اور باب السلسلۃ کے وسط میں واقع تھا۔ رنگ برنگ کے پتھروں اور سنگ مرمر کے تراشوں سے آراستہ اور مزین تھا۔ سلطان اشرف نے اس پر کافی زمین وقف کی، باتنخواہ مدرسین اور اہل علم فقہاء کا تقرر کیا۔

مملوکی عہد کا یہ آخری مدرسہ تھا۔ اس کی تعمیر کے ۳۵ سال بعد زمام اقتدار مملوکیوں سے عثمانیوں کو منتقل ہو گئی۔ اس مدت میں کوئی مدرسہ تعمیر نہ ہو سکا۔

عثمانیوں نے ایوبیوں اور مملوکیوں کی طرح مدارس کی تعمیر و ترقی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، بلکہ ان کی تمام تر توجہ مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ کی توسیع و ترمیم تک محدود رہی۔ جملہ سلاطین آل عثمان میں صرف سلطان سلیمان قانونی ایسے تھے جنہوں نے بیت المقدس میں نمایاں نقوش چھوڑے ہیں۔ انہوں نے مسجد صخرہ کی توسیع کے علاوہ شہر کے اطراف فصیل بھی تعمیر کروائی جس کے گرد و پیش بازار جاری تھے۔ سلطان کی ایک روسی النسل خاتون نے ۹۵۹ھ میں طلباء کی رہائش کے لیے "تکیہ خاصکی سلطان" کے نام سے ایک آبادی بسائی۔ بایرام جاویش نے جو کہ سلطان کی جانب سے فصیل کے تعمیری نگراں مقرر کیے گئے تھے ۹۴۳ھ میں ایک سرائے اور بچوں کے لیے ایک مکتب قائم کیا۔ یہ مکتب برطانوی عہد استعمار میں "مدرسہ الصاحبیہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ پورے عثمانی عہد میں کسی درسگاہ یا ادارے کا ذکر نہیں ملتا۔

ایوبی اور مملوکی عہد کے مدارس عثمانی دور کی پہلی اور دوسری صدی میں گو حکومت کی توجہ سے محروم رہے تاہم اوقاف کی آمدنی سے ان کا سلسلہ قائم رہا، لیکن بارہویں صدی ہجری کے آخری نصف سے یہ مدارس ضعف و اضمحلال کے شکار ہوئے اور رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو گئے۔

مشہور ترکی سیاح اولیا چلبی ۱۰۸۱ھ میں بیت المقدس گیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں

مسجد اقصیٰ کے چاروں طرف ۴۰ مدرسوں کا ذکر کیا ہے۔ اولیا چلبی کا یہ اعداد و شمار مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جیسا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ بیت المقدس کے تمام مدارس مسجد اقصیٰ کے صرف دو طرف شمال اور مغرب میں واقع تھے، نیز یہ سیاح ایک جگہ ان مدرسوں کی تعداد دو سو بھی لکھتا ہے اور ایک دوسری جگہ تین سو کی تعداد بتلاتا ہے۔ اس سفرنامے میں مختلف اور گوناگوں تفصیلات کے باوجود تعلیم و تدریس یا مدرسین و طلباء کی بابت کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے[1]۔

اولیا چلبی کے بعد ۱۱۰۱ھ میں ایک دوسرے سیاح صوفی عبدالغنی نابلسی نے بیت المقدس کی زیارت کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے سفرنامے میں صرف عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سفرنامے میں مدرسہ اشرفیہ کے متعلق قدرے تفصیل اور مدرسہ صلاحیہ اور تنکزیہ کی بابت اجمالی طور پر عمارتوں کے حسن و متانت کا تو ذکر ہے لیکن اس میں کہیں بھی تعلیم و تربیت، درس و تدریس یا طلباء اور معلمین کا کوئی تذکرہ نہیں ہے[2]۔

مذکورہ بالا دونوں ہی سیاحوں کے سفرنامے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بیت المقدس کے تقریباً تمام مدارس درس و تدریس سے خالی ہو چکے تھے یا کم از کم ان میں تعلیمی سرگرمیاں اس قدر سرد پڑ چکی تھیں کہ زائرین کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ میرے خیال میں فن تعمیر و تربیت سے غفلت اور بے توجہی کے نتیجہ میں اگرچہ یہ مدارس زبردست اضمحلال کے شکار ہو چکے تھے تاہم ان میں کچھ نہ کچھ تعلیمی سلسلہ قائم تھا، کیونکہ شیخ جمال الدین بن محمد العجمی القدسی متوفی ۱۱۲۱ھ کے بارے میں یہ ملتا ہے کہ وہ دارالحدیث میں درس دیا کرتے تھے اور مدرسہ فاخریہ کی عمارت میں درس دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اس عہد کے متعدد علماء کی سوانح میں بھی حرم اقصیٰ اور مسجد صخرہ کے علاوہ

---

[1] سیاحت نامہ ترکی مطبوعہ استنبول ۱۹۳۵ء ج ۹ ص (۴۷۶، ۴۷۸ ـ ۴۸۰ ـ ۴۸۸) بیت المقدس میں فلسطینی میوزیم کی لائبریری سے ایک لائبریرین جناب اسطفان حنا اسطفان نے اولیا چلبی کے سفرنامے کا وہ حصہ جو بیت المقدس سے متعلق تھا ترکی زبان سے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ "دائرۃ الآثار الفلسطینیہ" کے جرنل میں شائع ہوا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ایک اسرائیلی اشاعتی کمپنی "آریل" نے اس کی دوبارہ اشاعت کی ہے۔

[2] عبدالغنی نابلسی کے اس سفرنامے کا عنوان "الحضرۃ الانسیۃ فی الرحلۃ القدسیۃ" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بیت المقدس کی لائبریری خالدیہ اور دمشق کی [illegible] لائبریری میں موجود ہے [illegible] ۱۹۰۲ء میں [illegible] شائع کیا۔

مختلف اسلامی مدارس میں درس دینے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ان مدرسوں میں مدرسہ صلاحیہ، منکزیہ، میمونیہ اور عثمانیہ کا نام خاص طور پر ملتا ہے جبکہ ان کے علاوہ کسی دوسرے مدرسہ کا تذکرہ ان کی سوانح میں نہیں ملتا ہے[1]۔

بیت المقدس کے ایک حنفی المسلک مفتی حسن بن عبد اللطیف الحسینی گذرے ہیں۔ انھوں نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں بیت المقدس کے بارہویں صدی ہجری کے علماء کی ایک سوانح مرتب کی تھی، لیکن یہ سوانح ابھی تک شائع نہیں ہوسکی ہے۔ البتہ اس کا ایک قلمی نسخہ برطانوی میوزیم میں محفوظ ہے[2]۔ اس مخطوطہ میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو مسجد اقصیٰ اور مسجد صخرہ کے علاوہ مدرسہ صلاحیہ، افضلیہ، بلدیہ، اور طشتمریہ میں درس و تدریس پر مامور تھے۔ البتہ ان مدرسوں کے علاوہ کسی دوسرے مدرسہ کا کوئی تذکرہ اس مخطوطہ میں نہیں ملتا ہے۔

مذکورہ بالا قرائن کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر سے بیت المقدس کے اسلامی مدارس غفلت اور بے اعتنائی کے شکار رہے، اور اس قدر تیزی سے تنزل کی سمت بڑھے کہ تیرہویں صدی کے آغاز ہی میں ان کا وجود ختم ہوگیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ محمد علی پاشا کے عہد اقتدار میں ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء تا ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء ملکی سطح پر تمام دفتری کاغذات میں کسی مدرسہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

بیت المقدس کے اسلامی مدارس کا یہ بھیانک عبرتناک انجام دراصل عثمانی حکمرانوں کی بے توجہی اور بد انتظامی کی وجہ سے ہوا۔ ان کے عہد میں کھلم کھلا دینی مناصب اور علمی مسند بیچی اور خریدی جانے لگی، نیز اہتمام و انصرام میں لاپرواہی کے علاوہ بغیر کسی صلاحیت کے یہ مسندیں وراثۃً منتقل ہونے لگیں۔ بیت المقدس کے بیشتر باصلاحیت علماء پایۂ تخت استنبول اور آس پاس کے مضافات کے شہروں میں ہجرت کر گئے۔ اور جو لوگ رہ گئے انھوں نے اوقاف کی جائیداد اور زمینوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنالیا۔

اب رہا یہ سوال کہ ان مدارس میں تعلیمی سلسلہ ختم ہوجانے کے بعد ان کی عمارتوں کا کیا حشر ہوا تو پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ مدرسہ جاولیہ اور منکزیہ کی عمارتیں پہلے ہی مملوکی عہد میں بیت المقدس کے وزراء

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محبی کی "خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر" اور مرادی کی "سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر"۔

[2] برطانوی میوزیم میں محفوظ اس قلمی نسخہ کا نمبر OR. ۳۰۴۷ ہے۔

اور قاضیوں کی رہائش گاہ بنادی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ تمام عمارتیں وقف کے مطابق تعلیم و تربیت ہی کے لئے استعمال ہوتی رہیں۔ لیکن عثمانی فرمانرواؤں نے اس سے کہیں آگے بڑھ کر مدرسہ جاولیہ کی عمارت کو دار القضاء اور منکزیہ کو شہر کا سکریٹریٹ آفس بنادیا، نیز انھوں نے باب الناظر میں واقع دو وقف سرائیوں کو قیدخانوں میں تبدیل کردیا۔ ان میں ایک سرائے علاء الدین آیدغدی نے ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ "سرائے علاء الدین بصیر" کے نام سے مشہور تھی، اور دوسری "سرائے منصوری" کے نام سے معروف تھی، اس کو سلطان منصور قلاوون نے ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء میں بنوایا تھا۔

عثمانیوں نے صرف مدرسہ میمونیہ کی عمارت میں تعلیمی سلسلہ باقی رکھا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں اس عمارت میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کیلئے ایک مکتب قائم کیا۔ یہ مکتب برطانوی عہد میں مامونیہ کے نام سے مشہور تھا، اس سے متصل ایک شعبہ نسواں بھی تھا۔ اس کے علاوہ کسی مدرسہ کی کوئی عمارت اس عہد میں تعلیم و تربیت کے لئے استعمال نہیں کی گئی۔

ایوبی اور مملوکی دور کے نمایاں اور عظیم مدرسوں یعنی صلاحیہ، افضلیہ، منکزیہ اور اشرفیہ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ مدرسہ صلاحیہ عثمانی عہد میں برسوں معطل پڑا رہا۔ جب عثمانیوں اور روسیوں کے درمیان قرم کی جنگ ہوئی تو اس میں فرانس نے عثمانیوں کا ساتھ دیا تھا، چنانچہ اس کے صلہ میں سلطان عبد المجید نے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں مدرسہ صلاحیہ کی عمارت نپولین ثالث کو ہبہ کردی، اور اس نے یہ عمارت انگریز پادریوں کے حوالے کردی اور انھوں نے اس کو کلیسا بنادیا اور اس سے متصل ایک "مشنری اسکول" بھی "مدرسہ سالا جوزیف" کے نام سے تعمیر کیا۔ لیکن جلد ہی جنگ عظیم اول کے دوران جبکہ عثمانی حکومت کا ٹکراؤ برطانیہ و فرانس سے ہوگیا، شام و فلسطین کے ایک فوجی جنرل جمال پاشا نے بیت المقدس کے تمام اسلامی مدارس پر قبضہ کرلیا، اور عیسائیوں کے مشنری اسکول "لابوسیہ" کی عمارت میں "صلاحیہ کالج" کی بنیاد ڈالدی۔ یہ کالج برطانوی عہد استعمار سے پہلے تک یعنی ۱۹۱۷ء تک قائم رہا۔

مدرسہ افضلیہ کی عمارت کا بیشتر حصہ عثمانی عہد ہی میں بوسیدہ ہوکر منہدم ہوچکا تھا، صرف اس کا ایک کمرہ باقی بچا تھا جس میں اسی مدرسہ کے ایک استاذ شیخ عید کی قبر تھی، یہ غالباً اس مدرسہ کے آخری استاذ تھے۔ ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے حی المغاربہ کی تمام عمارتوں کے ساتھ اس کمرے کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مدرسہ منکزیہ کی عمارت عثمانی عہد میں شرعی عدالت بنا دی گئی تھی۔ پھر برطانوی عہد استعمار میں اس کو مجلس اسلامی کے صدر کی قیام گاہ بنا دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے اس عمارت میں ایک تہہ خانہ کھود کر اس میں اپنی ایک عبادت گاہ بنالی ہے۔

مدرسہ اشرفیہ کی عمارت عثمانی عہد میں ایک زبردست زلزلہ کی شکار ہوئی جس سے اس کا زیادہ تر حصہ تباہ ہوگیا۔ عثمانی فرمانرواؤں نے اس کی مرمت و اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس عمارت کا جو حصہ زلزلہ سے محفوظ تھا اس کو بیت المقدس کے اسلامی ادوار کے آثار کا میوزیم بنا دیا گیا ہے۔

برطانوی عہد استعمار میں جناب امین الحسینی کی زیر صدارت ایک اسلامی مجلس کا قیام عمل میں آیا تھا، چنانچہ مدرسہ منجکیہ اور اس سے متصل مدرسہ حسینیہ کی عمارت کو اس مجلس کا دفتر بنا دیا گیا، نیز اسی مجلس نے مدرسہ جاولیہ، محدثیہ اور نفیسیہ کو ثانوی اسکول، اور باسطیہ اور وداریہ کو یتیموں کی تعلیم گاہ، اور مدرسہ اسعردیہ کو مسجد اقصیٰ کا کتب خانہ بنا دیا۔ حرم سرائے منصوری وقف کے مطابق بیت المقدس کے زائرین کے لئے مخصوص رہی۔

مجلس اسلامی کے صدر جناب امین الحسینی ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ بیت المقدس کے تعلقات مسلمانان عالم کے ساتھ استوار و خوشگوار رہیں اور اس کے لئے وہ برابر کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب مشہور ہندوستانی لیڈر محمد علی جوہر کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ انھیں بیت المقدس میں دفن کئے جانے کی اجازت دی بلکہ مدرسہ خاتونیہ کا ایک کمرہ ان کی آخری آرام گاہ کے لیے مخصوص کیا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ بیت المقدس کی چہار دیواری کی جانب کھلتا تھا۔ مدرسہ ارغونیہ کے ایک کمرے میں فلسطین کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے صدر موسیٰ کاظم اور سید عبدالقادر شہید بھی مدفون ہیں۔ سید عبدالقادر ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف لڑتے ہوئے قسطل کے معرکہ میں شہید ہوئے تھے۔ اسی طرح حسین بن علی شریف مکہ بھی مدرسہ ارغونیہ کے ایک کمرے میں مدفون ہیں۔ اس کمرہ کا بھی ایک دروازہ حرم اقصیٰ کی جانب کھلتا ہے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ مدرسہ افضلیہ و قرمی کی عمارت ۱۹۶۷ء میں یہودیوں کے ہاتھوں ختم کی جا چکی ہے، ان کے علاوہ بقیہ مدارس کو جنگ ۱۹۶۷ء میں بھی کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا ہے۔ وہ تباہ و برباد کر دیئے گئے ہیں۔ یہودیوں نے ان عمارتوں کے اطراف آثار قدیمہ کی تلاش میں کھدائی کی ہے جس کی وجہ سے مدرسہ عثمانیہ، ارغونیہ، جوہریہ اور ان سے متصل سرائے کرد کا کافی حصہ متاثر ہوکر منہدم بھی ہوچکا ہے نیز مدرسہ منکزیہ اور دار القرآن اسلامیہ کی عمارتوں کو اسرائیلی فوج کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا — ترجمانی: ابو جاوید

حضرت عمیر بن وہب جمحی رضی اللہ عنہ

عمیر بن وہب جمحی جنگ بدر سے خود تو اپنی جان بچا کر صحیح سلامت واپس آگیا مگر اپنے پیچھے اپنے لڑکے کو مدینہ میں چھوڑ آیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس کے جرائم کے بدلے میں بیٹے سے مواخذہ کریں گے اور ان اذیتوں اور تکلیفوں کے بدلے میں سخت دردناک سزائیں دیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت سے باز رکھنے اور ان کے صحابہ کو اس سے پھیرنے کے لئے دیا کرتا تھا۔

ایک روز عمیر چاشت کے وقت بیت اللہ کا طواف کرنے اور وہاں رکھے بتوں سے برکت حاصل کرنے کی نیت سے مسجد حرام میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے صفوان بن امیہ کو حطیم[1] کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا تو اس کی طرف بڑھ گیا، اور اسے سلام کیا۔ صفوان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا: "عمیر! آؤ بیٹھو، کچھ دیر باتیں کریں۔ باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔" عمیر صفوان کے بازو میں بیٹھ گیا اور دونوں کے درمیان جنگ بدر اور اس میں نازل ہونے والی مصیبت کا ذکر چھڑ گیا۔ وہ اپنے ان قیدیوں کو شمار کر رہے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے تھے۔ صفوان نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم، ان لوگوں کے بغیر اب زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہ گیا ہے۔"

"تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔" عمیر نے اس کی تائید کی۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"رب کعبہ کی قسم، اگر میرے ذمے وہ قرض نہ ہوتے جن کی ادائیگی کا میرے پاس کوئی بندوبست نہیں ہے، اور میرے اہل و عیال نہ ہوتے جن کے اپنے بعد ہلاک ہو جانے کا مجھے شدید اندیشہ لاحق ہے

[1] حطیم: کعبہ سے متصل شمال کی جانب ایک جگہ۔

تو سیدھا یثرب جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ کر دیتا اور اس فتنے کا سدباب کر دیتا جو ہمارے لئے پریشانی کا سبب ہوا ہے۔" (نعوذ باللہ من ذالک) پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"مسلمانوں کے یہاں میرے لڑکے وہب کی موجودگی کے سبب میرا وہاں جانا ان کے لئے کسی تشویش یا شبہ کا باعث بھی نہیں ہوگا۔"

صفوان نے عمیر کی اس بات کو غنیمت سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ آیا ہوا یہ بہترین موقع ضائع ہو جائے اس نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"عمیر! تم اپنا سارا قرض میرے اوپر چھوڑ دو۔ چاہے وہ جتنا بھی ہو میں اسے تمہاری طرف سے ادا کر دوں گا اور تمہارے اہل وعیال کو اپنے اہل وعیال میں شامل کر کے زندگی بھر ان کی پوری کفالت کرتا رہوں گا۔ میرے پاس جو دولت ہے وہ ان سب کے گذر بسر کیلئے کافی ہے۔ وہ اس سے خوشحالی اور فراغت کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں۔"

"تب ہماری اس باہمی گفتگو کو پوشیدہ ہی تک محدود رکھنا۔ کسی دوسرے کو اس سے آگاہ نہ کرنا۔" عمیر نے صفوان کو رازداری کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ میں تمہارے لئے اس کا ذمہ لیتا ہوں۔" صفوان نے اس کو اطمینان دلایا۔

عمیر مسجد سے اٹھ کر باہر آیا تو اس کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض وکینہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اپنے اس ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لئے ضروری انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اسکو اپنے اس سفر اور اس کے مقصد کے بارے میں کسی شخص کی طرف سے کسی قسم کا قطعی کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت قیدیوں کے فدیے کی ادائیگی کے سلسلے میں ان کے قریبی رشتہ داروں کی یثرب کی طرف آمد ورفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

عمیر نے اپنی تلوار کو صیقل کرنے اور اس کو زہر میں بجھانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے اپنی سواری کی اونٹنی طلب کی۔ وہ تیار کر کے اس کے سامنے لائی گئی اور وہ اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اور اپنے دل میں بغض وعداوت اور شر وفساد کے ناپاک جذبات لئے مدینہ کی سمت چل پڑا۔ عمیر مدینہ پہونچا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے مسجد کا رخ کیا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) جب وہ مسجد کے دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور اس سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

کچھ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مسجد کے دروازے کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ آپس میں جنگ بدر اور اس میں قتل ہونے والے قریشیوں اور ان کے قیدیوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ مسلمان مہاجرینؓ وانصار کے دلیرانہ کارناموں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کر رہے تھے جو اس نے مسلمانوں کی فتح وکامرانی اور ان کے دشمنوں کی ذلت آمیز شکست کی شکل میں ان کے اوپر کیا تھا۔ یکایک حضرت عمرؓ کی توجہ بدلا اور ان کی نظر عمیر بن وہب پر پڑی جو اپنی سواری سے اتر کر تلوار لٹکائے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ گھبرا اٹھے اور یہ کہتے ہوئے دوڑے۔

"یہ کتا اور دشمن خدا عمیر بن وہب ہے..... خدا کی قسم یہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہے۔ یہ مکہ میں مشرکین کو ہمارے خلاف اکسایا کرتا اور جنگ بدر سے پہلے ہمارے خلاف جاسوسی کیا کرتا تھا۔" پھر انھوں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"تم لوگ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جاؤ اور آپ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔ اور ہوشیار رہنا کہیں یہ خبیث مکار کوئی دھوکہ نہ کر دے۔" پھر وہ خود چلتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ دشمن خدا عمیر بن وہب ہے جو تلوار سے مسلح ہو کر آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور کسی برے ارادے سے یہاں آیا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سن کر فرمایا کہ "اسے میرے پاس لے آؤ۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمیر بن وہب کے پاس پہنچے اور اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اور اس کی گردن کو تلوار کے تسمے میں پھنسا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس حال میں دیکھا تو فرمایا کہ "عمر! اس کو چھوڑ کر دور ہٹ جاؤ" پھر آپ نے عمیر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اسے اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے آپ کے نزدیک جا کر جاہلیت کے طریقے سے سلام کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "عمیر! اللہ تعالیٰ نے ہم کو تمہارے طریقہ سلام سے بہتر سلام سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو وہ سلام، سے نوازا ہے جو اہل جنت کا طریقہ سلام ہے۔"

"واللہ آپ ہمارے طریقہ سلام سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے آپ کے سلام کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا۔" عمیر نے کہا۔

"عمیر! تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟" رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔

"اس قیدی کی رہائی کی امید لیکر آیا ہوں جو آپ کے قبضہ میں ہے۔ آپ اس کو رہا کر کے میرے اوپر احسان کیجئے۔" عمیر نے بہانہ بنایا۔

"پھر تمہاری کمر میں یہ تلوار کیسی لٹک رہی ہے؟" آپ نے اس کے دل کا چور پکڑتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ ان تلواروں کا برا کرے، کیا جنگ بدر کے روز یہ ہمارے کسی کام آسکیں؟" اس نے ایک اور پردہ ڈالنا چاہا۔

"عمیر! مجھ سے سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے۔" آپ نے اس کی ان باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔

"بس واقعی صرف اسی کام سے آیا ہوں۔" وہ ایک بار پھر سفید جھوٹ بولا۔

"نہیں صحیح بات یہ ہے کہ تم اور صفوان بن امیہ حجر کے پاس بیٹھے تھے۔ اور تم نے قریش کے ان مقتولین کا ذکر کیا جو بدر کے گڑھے میں ڈال دیئے گئے تھے۔ پھر تم نے کہا تھا کہ اگر میرے اوپر قرض کا بوجھ اور اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں یثرب جا کر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کر دیتا۔ تو صفوان نے اس شرط پر کہ تم مجھے قتل کر دو گے تمہارے قرضوں کی ادائیگی اور تمہارے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ لیکن یاد رکھو تمہارے اور اس ناپاک ارادے کے درمیان اللہ تعالے حائل ہے۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

یہ سنکر تھوڑی دیر کے لئے تو عمیر بن وہب بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ پھر یوں اٹھا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں۔" اس کے بعد اس نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کی بیان کردہ آسمانی خبروں اور آپ کے اوپر نازل شدہ وحی کی تکذیب کرتے تھے۔ لیکن میرے اور صفوان کے مابین طے شدہ اس منصوبے کو میرے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ خدا کی قسم اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارے اس خفیہ منصوبہ سے خدا کے سوا کسی دوسرے نے آپ کو آگاہ نہیں کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ مجھے یہاں کھینچ لایا تاکہ مجھے دولت ایمان سے سرفراز فرمائے۔" پھر وہ کلمۂ شہادت پڑھکر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ "اپنے بھائی کو دین سکھاؤ اسے قرآن کی تعلیم دو

اور اس کے قیدی کو آزاد کر دو۔"

عمیر بن وہب کے آگے پر مسلمانوں نے غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "جس وقت عمیر بن وہب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہے، وہ میرے نزدیک خنزیر سے بھی بدتر تھا، لیکن آج وہ میرے بعض بیٹوں سے بھی زیادہ مجھے محبوب ہے"

حضرت عمیر بن وہب مدینہ میں رک گئے۔ وہاں رک کر وہ اسلامی تعلیمات کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتے، قرآن کے نور سے اپنے دل کو منور کرتے اور اپنی زندگی کے بارونق اور مطمئن ترین ایام گذار رہے۔ اور اس مدت کے دوران صفوان بن امیہ اپنے دل کو جھوٹی امیدوں سے بہلاتا رہا۔ جب بھی اس کا گذر قریش کی مجلسوں کی طرف ہوتا، وہ ان کو خوش خبری دیتے ہوئے کہتا کہ "عنقریب تمہارے پاس ایک ایسی اہم اور مسرت افزا خبر آنے والی ہے جو بدر کے اندوہناک سانحے کے اثرات کو تمہارے دلوں سے محو کر دے گی۔"

لیکن جب اس کے انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں تو بتدریج اضطراب و بے چینی اس کے دل میں سرایت کرنے لگی اور لمحہ بہ لمحہ اس کی بے قراری اور پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ وہ مدینہ کی طرف سے آنے والے قافلوں سے حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرتا مگر کسی کے پاس اس کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہوتا تھا۔۔۔ آخر کار ایک سوار نے آکر اس کو یہ اطلاع دی کہ "عمیر نے اسلام قبول کر لیا ہے۔" یہ خبر صفوان بن امیہ پر بجلی بن کر گری۔ کیونکہ اس کو اس بات کا یقین تھا کہ عمیر بن وہب ہرگز اسلام نہیں قبول کر سکتا چاہے روئے زمین پر بسنے والا ہر شخص مسلمان ہو جائے۔

ادھر حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ برابر اپنے دین کا علم حاصل کرتے رہے اور جہاں تک ممکن ہوا اپنے رب کے کلام کو حفظ کرتے رہے۔ پھر ایک روز انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم! ماضی میں ایک طویل مدت تک میں خدا کے نور کو بجھانے کی کوشش میں لگا رہا اور دین اسلام کو قبول کرنے والوں کو سخت قسم کی اذیتیں دیتا رہا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو مکہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ وہاں پہنچ کر میں قریش کو خدا اور

اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دوں ۔ اگر وہ میری دعوت کو قبول کرلیں گے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا ۔ لیکن اگر انھوں نے میری اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو میں انکو بھی بت پرستی اور انکار اسلام کے جرم میں ویسی ہی اذیتیں دوں گا جیسی اصحاب رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو اسلام قبول کرنے پر دیا کرتا تھا ۔"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دیدی ۔ اجازت پاکر وہ مکہ آئے اور صفوان بن امیہ کے گھر پہنچے اور اس سے بولے ۔ "صفوان! تمہارا شمار مکہ کے سربرآوردہ لوگوں اور قریش کے اصحاب عقل ودانش میں ہوتا ہے ۔ کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو ان پتھروں کی پرستش اور ان کے لئے قربانی کرنے کا جو طریقہ تم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے، وہ عقل کی رو سے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ ہے؟ میں تو اسے درست نہیں سمجھتا، اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا حقیقت میں کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں ۔"

پھر حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ مکہ میں دعوت الی اللہ کے کام میں جٹ گئے اور بڑی تعداد میں لوگ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ اللہ تعالیٰ حضرت عمیر بن وہب کو بہترین اجر سے نوازے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے ۔ آمین

جنت غافل کیلئے نہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جس مسافر کو ڈر ہوتا ہے کہ وہ راستہ ہی میں رہ جائے گا وہ پھر ٹھنڈے وقت میں اپنی منزل پر پہنچ پائے گا ۔ وہ رات کے آغاز ہی میں نیند کو قربان کرکے سفر شروع کر دیتا ہے ۔ اور ٹھنڈے وقت میں اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے ۔ اے خدا کے مال کے خریدارو! خدا کا مال قیمتی مال ہے، سنو خدا کے مال کا نام جنت ہے ۔ (ترجمہ ترمذی شریف ۔ ابوہریرہؓ)

حکیم عبدالباری فلاحی
ہمدرد نگر، نئی دہلی

برامکہ اور ان کی طبی خدمات

برامکہ لفظ برمک کی جمع ہے ۔ یہ کسی خاص فرد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا لقب ہے جو بلخ کے نزدیک نوبہار کے پرستش گاہ کے پجاریوں کو اعزازاً دیا جاتا تھا[1] ۔ اس کی تائید لفظ کے اشتقاق سے بھی ہوتی ہے در اصل یہ لقب سنسکرت کے لفظ "پرمک" سے نکلا ہے جس کے معنی اعلیٰ اور افضل کے ہیں اسی طرح لفظ "نوبہار" بھی سنسکرت کے لفظ "نووار" سے ماخوذ ہے جس کے معنی نئی خانقاہ کے ہوتے ہیں[2] ۔ تمام کتابوں میں جہاں کہیں بھی برامکہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد یہی خاندان ہے جس کے افراد عباسی خلفاء کے وزیر رہے ہیں ۔ علامہ مسعودی اپنی کتاب "تاریخ مروج الذہب و معادن الجوہر" دنیا کے مشہور آتشکدوں اور بت خانوں کے بارے میں فرماتے ہیں[3]

"والبیت الرابع ہو نوبہار الذی بناہ منوشہر بمدینۃ بلخ من خراسان علی رسم القمر وکان من یلی سدانتہ تعظمہ الملوک فی ذالک البقع وتنقاد الی امرہ وترجع الی حکمہ وتحمل الیہ الاموال و کانت علیہ وقوف وکان الموکل سدانتہ یدعی البرمک وہو سمۃ عامۃ لکل سادنہ ومن اجل ذلک سمیت البرامکۃ لان خالد بن برمک کان من ولد من کان علی ہذا البیت ۔"

"چوتھا آتشکدہ نوبہار ہے جس کو منوچہر نے قمر کے نام پر خراسان کے شہر بلخ میں تعمیر کیا تھا

---

[1] دائرہ معارف اسلامیہ طبع اول، جلد ۴، مطبوعہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء ص ۲۷۵

[2] اسلامک کلچر جلد ۶، حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء ص

[3] حاشیہ کامل ابن اثیر جلد ۵، مطبوعہ ص ۱۱

اس علاقے کے بادشاہ آتشکدہ کے متولی کی تعظیم کرتے تھے اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے تھے اس پر بڑے بڑے چڑھاوے چڑھاتے تھے اور جاگیریں وقف تھیں۔ آتشکدہ کا متولی برمک کہلاتا تھا اور یہ ہر متولی نوبہار کا لقب تھا۔ یہی برامکہ کی وجہ تسمیہ ہے کیونکہ خالد بن جعفر برمک اسی آتشکدہ کا متولی تھا۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق نوبہار مجوسیوں کے کسی آتشکدہ کا نام نہیں تھا بلکہ بدھ مت کے پیروؤں کا ایک مزار تھا۔ سندھ میں بدھ مذہب کے بہت سے مزار تھے جو نوبہار کے نام سے جانے جاتے تھے اور برامکہ بدھ مت کے ماننے والے تھے[1]۔ اور اصلاً ان کا تعلق ہندوستان سے تھا کچھ معاصر شعراء نے اور دیگر افراد نے برامکہ کو مجوسی یا آتش پرست کہا ہے کیونکہ پرشیا میں آتش پرستی کے علاوہ عملی طور سے کوئی مذہب نہیں تھا اور مجوسی ہونے کے علاوہ کوئی وطنیت نہیں تھی۔ چونکہ برامکہ بودھ مت کے پیرو تھے اس لئے انھوں نے ہندوستان کے علوم وفنون سے دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور وہاں کے پنڈتوں اور حکماء کو طلب کیا[2]۔

یہی تحقیق زیادہ معتبر ہے۔ بعد کے تاریخ نگاروں نے اسی کو مستند قرار دیا ہے کہ برامکہ آتش پرست نہیں بلکہ بدھ مت کے ماننے والے تھے۔

جس طرح عباسی خلفاء نے تحت علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں کافی دلچسپی لی اور مترجمین اور ناقلین کے اندر شوق اور رغبت پیدا کیا اسی طرح برامکہ نے بھی جو کہ غالباً ایرانی تھے دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور مترجمین کو علوم کے ترجمہ اور نقل پر آمادہ کیا۔ خاندان برامکہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ دوام بخشا ہے وہ ان کے علمی کارنامے اور خدمات ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علمی اعتبار سے خلافت عباسیہ کو خلافت بنو امیہ پر جو فوقیت ہے وہ برامکہ کی وجہ سے ہے۔ اس خاندان کی خدمت میں جن دانشمندوں نے توجہ مرکوز کی وہ آل بختیشوع ہیں اس خاندان کا ایک ممتاز فرد جبرئیل بن بختیشوع تھا جس نے مامون رشید سے کہا تھا کہ میں اس نعمت کو ندتم

---

[1] اسلامک کلچر (انگریزی) ترجمہ از سید الحق، جلد ۶ حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء ص ۴۴

[2] ایضاً ص ۴۹

سے حاصل کیا ہے اور نہ تیرے باپ سے۔ بلکہ تمام تر یحیٰ بن خالد برمکی اور اس کی اولاد سے حاصل کیا ہے۔[1]

خاندان برامکہ کا مورث اعلیٰ اگرچہ پشتاسف ہے لیکن سب سے پہلا شخص جسکو برمک کے لقب سے پکارا گیا وہ جعفر بن جاماس ہے اور تمام مورخین نے برامکہ کی تاریخ عموماً جعفر سے شروع کی ہے۔

۱۔ جعفر بن جاماس

یہ علم وفضل میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ علم وادب، شاعری اور انشاء پردازی میں یگانۂ روزگار تھا جعفر کی قابلیت اس کو بلخ سے دمشق لے گئی اس وقت خاندان امیہ کا ساتواں حکمران ولید بن عبدالملک (متوفی ۷۱۵ء) تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھا۔ جعفر چونکہ بلخ کے بدھ مت مندر کا متولی تھا اس لئے معاشرہ میں اس کی کافی قدر ومنزلت تھی، اس نے اپنی زبان کی حلاوت اور کلام کی فصاحت وبلاغت کے ذریعہ خلیفہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور خلیفہ نے اسکو چیف سکریٹری کے عہدہ تک پہونچا دیا۔

جعفر برمکی سے متعلق ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں وہ یہ کہ اسکی پرورش ہندوستانی روایت کے مطابق کشمیر کے عیسائی خانقاہوں میں ہوئی تھی اور وہاں اس نے علم طب اور علم نجوم کا مطالعہ کیا۔ کشمیر میں اسکی تعلیم کا سبب یہ تھا کہ اس کے والد کو ترکی کے بادشاہ نیزک نے اس کی مذہبی اطاعت کی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور وہ خود کشمیر بھاگ گیا قتیبہ نے جب بلخ کو فتح کیا تھا تو اسوقت اس نے ایک کمانڈر کا علاج کیا تھا[2] اس کے علاوہ اس کو اموی شاہزادہ مسلمہ بن عبدالملک کو علاج کے لئے ۷۰۵ء میں دمشق طلب کیا گیا تھا وہاں اسکو کامیابی ملی[3]۔ جعفر کی طلبی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ولید ہاسپٹل (پہلا اسلامی ہاسپٹل) کی تعمیر میں رہنمائی کی ہوگی[4]۔

---

[1] تاریخ علوم عقلی در تمدن اسلامی از ذبیح اللہ صفا (چوتھا ایڈیشن) مطبوعہ طہران ص ۴۴

[2] اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسن۔ جلد ۴، نمبر ۳ جون ۱۹۸۰ء ص ۱۱۸

[3] دائرۂ معارف اسلامیہ، مطبوعہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء، جلد ۴، ص ۲۷۵

[4] اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسن، جون ۱۹۸۰ء ص ۱۱۳

۲۔ خالد برمکی:

یہ جعفر برمکی کا بیٹا تھا جو ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا اور مختلف علوم و فنون میں ماہر تھا اور علوم کی اشاعت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اس نے خاص طور سے ایرانی کتابوں کا ترجمہ کرایا کیونکہ فارسی النسل ہونے کی وجہ سے اس کو فارسی تصنیفات سے کافی شغف تھا خالد برمکی غالباً پہلا برمک تھا جس نے خاندان برامکہ میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا خلیفہ منصور کی خلافت میں یا بالفاظ دیگر خالد برمکی کے عہد امارت و وزارت میں دیگر علوم کے ساتھ طب کی جو ترقی ہوئی وہ لائق تحسین ہے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں[1]،

"خلیفہ منصور نے غیر زبانوں کی سیکڑوں کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں ایک طرف تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر حدیثوں کے جمع کرنے اور ایک مستقل کتاب لکھنے کی ہدایت کی دوسری طرف ایرانیوں کی سب سے قدیم اور مفصل تاریخ جسکا نام ہیکلین تھا اور جو فارسیوں کے نزدیک ایسی ہی عزت رکھتی تھی جیسے کہ ہندوؤں کے نزدیک مہابھارت کا ترجمہ کرایا ہندوستان کے علوم و فنون کے ساتھ بھی کچھ کم اعتنا نہیں کیا گیا بلکہ اسی زمانہ سے ہندو علماء بغداد کے دربار میں جمع ہونا شروع ہو گئے یہاں تک کہ خاندان برامکہ نے ایک ہندو طبیب کو اپنے اسپتال کا مہتمم اور افسر مقرر کیا۔ ان علماء کی بدولت اور نیز ان مسلمانوں کی وجہ سے جنہوں نے تحقیقات علمی کے لئے ہندوستان کا سفر کیا سنسکرت کی اکثر عمدہ تصنیفات بغداد کے کتب خانوں میں جمع ہو گئیں اور ان میں بالخصوص راجہ بسکھ واپر، امکر، رنگل، جبہر، اندی حاری، مانک، نوکسل، ردکسل، ردسا، رائے، کیل اور برامہر کی تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہوا"۔

جن حکماء نے یونانی، سریانی اور فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا وہ حسب ذیل ہیں۔

جورجیس بن جبرئیل، فرات بن شحناثا، عیسیٰ بن ماسرجیس، البطریق، یہ سب عیسائی عالم تھے عبداللہ بن مقفع، فضل بن نوبخت، اسماعیل بن ابو سہل بن نوبخت، یہ سب مجوسی عالم تھے۔

۳۔ **یحییٰ برمکی** (متوفی ۸۰۵ء):۔ یہ خالد برمکی کا ہونہار بیٹا تھا اس کا شمار دنیا کے

---

[1] محمڈن ایجوکیشنل میگزین نمبر ۳ جلد اول، سیالکوٹ پنجاب ۱۸۹۳ء ص ۱۰

ممتاز اور معروف اہل کمال میں ہوتا ہے یحییٰ برمکی کے سلسلے میں مورخین کا خیال ہے کہ تمام خاندان میں اس سے زیادہ کوئی صاحب الرائے، بردبار، عالی حوصلہ، خوش اخلاق، شجاع، فصیح و بلیغ، عقیل اور فیاض نہیں ہوا۔

یحییٰ برمکی علم اور اہل علم و فن کی دل سے قدر کرتا تھا۔ اس کی قدر دانی کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے ایک بار یحییٰ برمکی کو درد شکم کا عارضہ ہوا اکثر طبیبوں نے علاج کیا لیکن کسی سے بھی مکمل فائدہ نہیں ہوا۔ فضل اور جعفر برمکی کو سخت صدمہ ہوا۔ ایک دن ملک فارس میں ایک حاذق مجوسی طبیب کا پتہ چلا تو اسی وقت فارس کے والی کو خط لکھا گیا کہ مجوسی طبیب کو بلا تاخیر دار الخلافت میں روانہ کیا جائے۔ حاکم فارس نے ایک ہزار دینار سفر خرچ دیکر طبیب کو روانہ کیا۔ یحییٰ نے اس کی خوب قدر کی۔

ہارون رشید جب ۷۸۶ء میں تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس کا پہلا وزیر اعظم یحییٰ برمکی مقرر ہوا اور اس نے ہارون رشید کا علمی ذوق دیکھ کر مختلف علوم و فنون کے تراجم اور اشاعت پر کافی توجہ دی۔ یحییٰ برمکی کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی مثلاً ابو عمر ابان، اسحاق بن سلیمان الہاشمی اور ابو حاتم البلخی بھی دربار خلافت سے وابستہ تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ بااثر یحییٰ تھا۔ اس نے عالیشان محکمہ ترجمہ قائم کیا جس کا نام بیت الحکمت رکھا اس محکمہ میں یہودی، عیسائی، پارسی، اور ہندو علماء ترجمہ کے لئے مامور تھے جو ہمیشہ یونانی، شامی اور سنسکرت کی کتابوں سے فنون حکمت اور قدیم یونانی کتب کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یحییٰ برمکی نے فارسی النسل ہونے کی وجہ سے اگرچہ فارسی تصنیفات پر کافی توجہ دی لیکن دیگر زبانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا چنانچہ یحییٰ برمکی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان میں قاصد بھیجکر نامور پنڈتوں اور حکیموں کو طلب کیا جن میں منکہ، ابن دہن اور صالح بن بہلہ معروف پنڈت تھے۔

۱۔ **منکہ**: یہ اسحق بن سلیمان کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ علم طب میں کافی مہارت رکھتا تھا اس کے علاوہ علم ہندسہ اور علم ہندسیہ سے بھی خوب واقف تھا۔ فارسی اور عربی کا بھی علم رکھتا تھا ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید سخت بیماری میں مبتلا ہوا اور کسی طبیب کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو ابو عمر الاعجمی کے مشورہ سے خلیفہ نے منکہ کو بلوایا اور اس کے علاج سے

فائدہ ہوگیا۔ خلیفہ نے بطور انعام بہت بڑی جاگیر اسے عطا کی[1] اس کے بعد اس کا شمار خلیفہ کے مقرب درباریوں میں ہونے لگا۔ وہاں اس نے مذہب اسلام کا مکمل علم حاصل کیا اور اسلام کی حقانیت پر مسلم علماء سے گفتگو کرنے کے بعد حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا[2]۔

یہ برامکہ کے اسپتال سے وابستہ تھا اور ہندی زبان سے فارسی یا عربی میں ترجمہ کرتا تھا۔ کتابوں کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

۲- ابن دھن :- یہ ہندوستان کا مشہور طبیب تھا جو منکہ کے ساتھ بغداد میں رہتا تھا۔ اس کو یحییٰ برمکی نے طلب کیا تھا اور اس کو بیمارستان کا ڈائرکٹر مقرر کیا تھا۔ یحییٰ کے مشورہ سے اس نے بہت سی ہندوستانی طبی کتابوں کو فارسی یا عربی زبان میں منتقل کیا۔

۳- صالح بن بہلہ :- یہ بھی ہندوستان کا کامیاب طبیب تھا۔ اس کا نام یا تو "سالی" کی تبدیل شدہ عربی شکل ہے یا پھر دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے صالح نام پڑ گیا۔ یہ خلیفہ ہارون رشید کے دورِ حکومت میں بغداد میں طبابت کرتا تھا۔ یہ کسی اہم عہدہ پر فائز نہ تھا۔ کتابوں میں اس کے متعلق صرف اتنا ذکر ملتا ہے کہ اس نے ہارون رشید کے چچا ابراہیم کا علاج کیا تھا۔

یہ تینوں ہندوستان کے ممتاز طبیب تھے جن کے ذریعہ ہندوستان کا بہت بڑا علمی سرمایہ عرب ممالک میں پہونچا۔ جب حکماء کی قدر و منزلت بڑھنے لگی تو اور بھی ہندوستانی حکماء بغداد پہونچے جن میں سے کنکہ، صنجہل، شاناق اور جودر بہت ہی نمایاں تھے۔

۱- کنکہ :- یہ ہندوستان کے ممتاز حکیموں میں سے تھا۔ علم طب میں گہری نظر رکھتا تھا۔ ادویہ کے خواص اور ان کی تاثیرات سے بخوبی واقف تھا۔ علم نجوم اور ہیئت میں بھی درک رکھتا تھا۔ طبابت کے علاوہ ترجمہ کا بھی کام کرتا تھا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں (۱) کتاب النمودار فی الاعمار (۲) کتاب اسرار المو الید (۳) کتاب القرانات (۴) کتاب فی التوہم (۵) کتاب فی الاحداث العالمی فی القران (۶) کتاب فی علم الطب۔

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۵ء ص ۴۷۵

[2] کتاب الحیوان للجاحظ، جلد سوم ص ۶۵

۲- صنجہل :- یہ بھی علم طب اور نجوم میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس کی مشہور تصنیف کتاب المو الید ہے۔

۳- شاناق :- یہ بھی ایک معروف طبیب تھا اور اس کو علم طب کے علاوہ سائنس اور فلسفہ کے دیگر شعبوں میں بھی مہارت حاصل تھی۔ شاناق نے جو کتابیں لکھیں وہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) کتاب السموم جو کہ پانچ مقالات پر مشتمل ہے (۲) کتاب فی النجوم (۳) منتحل الجوہر۔

۴- جودر :- یہ بھی اپنے دور کا ممتاز فلسفی اور طبیب تھا۔ اس نے سائنسی موضوعات پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں کتاب المو الید بہت مشہور ہے۔

جن کتابوں کا ترجمہ یحییٰ برمکی کے حکم سے ہوا یا دیگر مترجمین نے خود ترجمہ کرکے یحییٰ کے سامنے پیش کیا وہ حسب ذیل ہیں۔

نام کتاب	نام مصنف یا مترجم	موضوع
۱- کتاب سسرد	سسرت ہندی	یہ کتاب امراض اور ادویہ سے متعلق ہے منکہ ہندی کو جب بیمارستان برامکہ کا ڈائرکٹر مقرر کیا تھا تو اس وقت اس نے یحییٰ برمکی کے حکم سے ہندی سے عربی میں منتقل کیا۔ یہ دس مقالات پر مشتمل ہے۔
۲- قرابادین	کنکہ ہندی	یہ دراصل اہرون القس کی تصنیف ہے جو سریانی زبان میں تھی پہلے مروان کے عہد میں علماء کو یہ یہودی نے عربی میں ترجمہ کیا بعد میں کنکہ نے اسکو جدید طرز میں مختصر کرکے یحییٰ برمکی کے سامنے پیش کیا۔
۳- کتاب محمد بن الليث	محمد بن الليث	اس کتاب کا اصلی نام معلوم نہیں لیکن یحییٰ برمکی کے میر منشی محمد بن ابو اللیث نے امراض اور ان سے متعلق کیس کے علاجات میں یحییٰ کیلئے پیش کی۔
۴- کتاب [illegible] الطب	—	اصلی مصنف کے بارے میں معلوم نہیں [illegible]

		عطار کی تشریح اور اس کے اقسام پر پہلی کتاب جو لکھی گئی وہ یہی تھی چنانچہ عطاروں کی ایک مشہور عطر ہے۔
۵۔ کتاب سیرک	سیرک	پہلے ہندی سے فارسی میں ترجمہ غالباً منکہ نے کیا تھا بعد میں عبداللہ بن علی نے فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔
۶۔ کتاب السموم	شاناق ہندی	یہ پانچ مقالات پر مشتمل ہے منکہ ہندی نے یحییٰ برمکی کے حکم سے ہندی سے فارسی میں منتقل کیا۔ بعد میں مامون رشید کے حکم سے عباس بن سعید الجوہری نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں ہیں جن کا ترجمہ ہندی حکیموں نے خاص یحییٰ برمکی کے اشارہ سے کیا ہوگا اور وہ حسب ذیل ہیں[1]۔

۱۔ کتاب ندان	—	اس کتاب کے عربی مترجم کا نام نہیں معلوم۔ البتہ اس میں ۴۰۴ امراض کی علامتیں اور شناخت درج ہیں اور طریقہ علاج کے بیان سے خالی ہے۔
۲۔ سندھشان	—	اس لفظ کا معنی ابن الندیم نے "صورۃ النجح" لکھا ہے جو کہ "اسد ھوگ" کی عربی شکل ہے اس کے معنی اکسیر کامیابی کے ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ ابن دھن نے کیا تھا اور

[1] الفہرست لابن الندیم (اردو ترجمہ) ص ۶۹۵

		یہ طب سے متعلق معلوم ہوتی ہے اسحاق بن سلیمان کے لئے منکہ نے اس کی شرح لکھی
۳۔ کتاب اسماء عقاقیر الہند۔	—	
۴۔ کتاب علاجات الحبالی للہند۔	—	
۵۔ کتاب توقشتل۔	—	اس میں سو بیماریوں اور سو (۱۰۰) دواؤں کا ذکر ہے۔
۶۔ کتاب روسا الہندیہ فی علاجات النساء۔		
۷۔ کتاب السکر الہند۔		
۸۔ کتاب رای الہندی فی اجناس الحیات وسمومہا۔		سانپوں کی اقسام اور ان کے زہروں کی تشریح کی گئی ہے۔
۹۔ کتاب التوہم فی الامراض والعلل۔		یہ توقشتل ہندی کی تصنیف ہے۔
۱۰۔ کتاب استنکر بتفسیر ابن دھن۔		

یحییٰ کے علمی ذوق کا اندازہ اس کے عظیم الشان کتب خانہ سے ہوتا ہے ابو عثمان بن بحر الجاحظ لکھتا ہے کہ جس قدر کتابیں یحییٰ کے کتب خانہ میں موجود تھیں کسی بادشاہ کے پاس اتنی کتابیں نہیں تھیں ہر کتاب کے تین تین نسخے موجود تھے اور اس وقت یہ مشہور بات ہے کہ اگر کوئی نایاب کتاب فروخت کی جاتی تو پہلے یحییٰ برمکی کو دکھائی جاتی کیونکہ ایک درہم کے بجائے ہزار درہم دینے والا شخص یحییٰ برمکی تھا خلیفہ ہارون رشید کی لائبریری کی اکثر مشہور کتابیں یحییٰ کے کتب خانہ کی تھیں۔

حقیقت میں یحییٰ کی ہمہ دانی حیرت انگیز ہے وہ علم طب، نجوم، ادب، شاعری، فقہ اور ہیئت میں مجتہدین فن کے درجہ پر شمار کیا جاتا ہے۔ یحییٰ برمکی اگرچہ جامع علوم تھا لیکن اس کی دلچسپی ہیئت و نجوم سے تھی۔ جہاں شعراء اور ادباء کا گروہ دربار میں موجود رہتا تھا وہاں منجم بھی ہوتے تھے غالباً ہندی حکیموں کے اختلاط کا بھی بڑا سبب نجوم کا شوق تھا۔

۴۔ فضل برمکی: — یہ یحییٰ کا بیٹا تھا۔ اس نے بھی برامکہ کا نام روشن کیا اور علمی

ترقی میں کافی شہرت حاصل کی مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فضل تیغ اور قلم دونوں کا مالک تھا۔ یہ یحییٰ برمکی کی ضعیفی کے بعد ۱۷۸ھ میں ہارون رشید کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ علوم و فنون کی ترقی میں مورخین نے فضل برمکی کا نام یحییٰ اور جعفر کے بعد لکھا ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ اس قابل تھا کہ اس کا نام سب سے پہلے لکھا جائے کیونکہ جس دور میں تصنیف و تالیف کی بنیاد پڑی اس وقت مصنفین کے پاس قلم دوات کے سوا کچھ نہ تھا فضل نے اپنی توجہ خاص سے کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا اور اس کے نتیجہ میں اس قدر تصنیفات ہوئیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۵- ابوالفضل جعفر برمکی: اہل فارس کی علمی اصطلاح "زر جعفری" اسی نام سے قائم ہوئی۔ اسلامی تاریخ میں مختلف حیثیتوں سے جعفر برمکی ایک ایسی شخصیت ہے جس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے اس نے اپنے خاندان کو شہنشاہوں سے زیادہ شہرت دی ہے۔ یحییٰ برمکی کا یہ نامور بیٹا گو عمر میں فضل سے چھوٹا تھا لیکن بقول ایک شاعر کے کہ "بزرگی بہ عقل است نہ بسال" فضل سے افضل تھا۔ جعفر کا علمی ذوق بہت بلند تھا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم ادب، فقہ، نجوم اور دیگر علوم میں کمال رکھتا تھا اس نے محض اپنے علمی ذوق کی وجہ سے مختلف علوم و فنون کے فروغ میں کافی دلچسپی لی۔ ●

"انجمن کا چوتھا دوسالہ اجلاس"

برادران عزیز! انجمن طلبہ قدیم کا چوتھا دوسالہ اجلاس انشاء اللہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۱۹۹۱ء کو جامعہ میں منعقد ہو رہا ہے۔ تاریخیں متعین ہو گئی ہیں مگر ابھی تفصیلی پروگرام طے نہیں کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے قیمتی مشورے اور رائیں مطلوب ہیں تاکہ اس کی روشنی میں پروگرام کو قطعیت دی جا سکے۔ آپ اس پتے پر اپنی قیمتی رائے ارسال کریں۔

● انصار احمد فلاحی۔ بلریا گنج اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۱۲۱ ●

ترکی میں کفر ٹوٹ رہا ہے

"رجعت پسند مذہبی تنظیمیں مختلف بھیسوں میں اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ہم گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ میں نوجوانوں کو اس سے خبردار اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہوں، ہماری یونیورسٹیوں کو رجعت پسندی اور مذہبی قدامت پسندی کے خلاف مضبوط قلعے بن جانا چاہئے"

یہ ایک ایسے ملک کے صدر کی تقریر کا ایک ٹکڑا ہے جسے کبھی اسلامی سلطنت کے دارالخلافہ اور مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا لیکن ۱۹۲۲ء میں جب مصطفیٰ کمال اتاترک نے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی تو اس نے اس کو دارالاسلام سے دارالکفر بنا دیا اور تمام اسلامی شعائر اور رسم و رواج کو منسوخ کر دیا حتیٰ کہ نماز اذان پر بھی پابندی لگا دی اور ترکی کو ایک سیکولر اور بے دین ریاست بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور آج وہ ۵۵ سال بعد اس کا جانشین ملک کا صدر کنعان ایورن [illegible] گیا ہے۔ وہ پریشان ہے اور کبھی غصے کے عالم میں اور کبھی بوکھلاہٹ کے عالم میں ریڈیو اور ٹی وی پر بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ وہ نوجوان کو نصیحت کرتا ہے کہ خبردار مذہب کی طرف واپس نہ آؤ، اور کہتا ہے کہ ہمارے کالجز اور یونیورسٹیاں مذہب پر بند لگائیں اور وہ مذہب کی راہ میں سد سکندری بن جائیں اس نے اسکولوں اور کالجز میں یہ پابندی لگا دی ہے کہ طالبات اپنا سر اور سینہ ڈھانکیں یعنی دوپٹہ اور برقعہ نہ اوڑھیں اور لڑکے اسلامی شعار سے دور رہیں۔ مگر نئی نوجوان نسل اسلام کی طرف تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور سختی سے اسلامی شعائر کی پابند ہوتی جا رہی ہے۔

ترکی میں یہ تبدیلی ۵۵ سال کی خاموش جد و جہد کا نتیجہ ہے جو علماء کرام، داعیان اسلام اور ان ماؤں اور بہنوں کی مرہون منت ہے جو رات کے سناٹے میں شمع کی دھیمی لو میں اپنے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں شعائر اسلام کی تعلیم دیتی تھیں آج وہ نسل جوان ہو گئی ہے اور اسلام کو اپنانے کے لئے بے چین ہے ترکی کا بوڑھا صدر کنعان ایورن اپنی طاقت اور فوج کے بل پر اس انقلاب کو کب تک روکے رکھے گا اور کب تک امریکہ اسرائیل اور باطل ظالموں کی خوشنودی کے لئے ایمان اور اہل ایمان کا سودا کرتا رہے گا کاش اسے جلد حقیقت کا ادراک ہو جاتا۔

ڈاکٹر محسن عبدالحمید

میرے سر پر جتنے بال ہیں اتنے ہی بال سر بن جائے
تو ہر سر کو راہِ خدا میں نچھاور کردوں

ترکی کے داعی کبیر علامہ سعید نورسی کی حیات پر نوٹ

شرقی اناطولیہ کے صوبہ بتلیس کے قصبوں میں ایک قصبہ "نورس" ہے۔ اس قصبہ کے ایک عالم متقی کردی خاندان میں ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں سعید نورسی پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ انھوں نے دینی مکاتب و مدارس میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ انھوں نے ابتدائی صرف و نحو کی تعلیم اپنے بھائی ملا عبداللہ اور دوسرے علماء سے حاصل کی پھر انھوں نے مختلف قصبوں اور شہروں میں جا کر مختصر کتابوں اور مستند اساتذہ سے دینی علوم پورے ذوق و شوق اور شغف کے ساتھ حاصل کئے۔ اللہ تعالٰی نے ان کو ایسی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ عطا کی تھی جس کو خارق عادت کہنا صحیح ہے۔ اس کا اعتراف ان کے تمام اساتذہ نے کیا ہے جن میں سے ہر ایک نے نورسی کے سخت امتحانات لئے اور وہ سب میں کامیاب ہوئے (مقالہ نگار نے ہر بات کے لئے مستند حوالے دیئے ہیں) نورسی کی قوت حافظہ کا حال یہ تھا کہ انھوں نے ایک ہفتہ میں "جمع الجوامع" جیسی مشکل کتاب یاد کرلی تھی۔ اپنے منطقہ کے تمام علماء کو مباحثوں میں انھوں نے شکست دی تو ان سب نے مل کر ان کا نام "سعید المشہور" رکھا۔ پھر وہ تبلیس گئے اور وہاں سے شہر "تیلو" گئے۔ اس شہر کی ایک عبادت گاہ میں معتکف ہو کر انھوں نے فیروزآبادی کی قاموس حرف سین تک یاد کرلی۔

درس و تدریس کی ابتداء ۱۸۹۲ء میں ملا سعید شہر ماردین گئے اور وہاں کی مسجد جامع میں درس دینا شروع کیا اور لوگوں کے سوالات کے جوابات بھی دینے لگے لیکن ان کے حاسدوں نے شہر کے حاکم سے ان کی چغلی کھائی اس نے ان کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا اور تبلیس پہنچا دئیے گئے۔

تبلیس کے عالم کو جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو اس نے اصرار کر کے ان کو اپنے پاس ٹھیرا لیا۔ یہاں ان کو فرصت ملی کہ اس کے وسیع کتب خانے سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ انھوں نے فلسفہ، علم کلام، منطق، تفسیر و حدیث و فقہ اور کتب نحو کا مطالعہ کیا اور جن علوم و فنون کے متون انھوں نے یاد کئے ان کی تعداد ۸۰ تک پہنچ گئی اور اسی شہر میں انھوں نے وہاں کے ایک بڑے عالم الشیخ محمد الکفروی سے علوم دین کی آخری تعلیم حاصل کی۔

بدیع الزماں کا لقب ۱۸۹۴ء میں وہ شہر وان گئے اور وہاں انھوں نے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طبقات الارض، فلسفہ جدیدہ، تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے علوم کا اتنا گہرا مطالعہ کیا اور وہ درجہ حاصل کیا کہ ان علوم کے متخصصین بھی حیران رہ گئے۔ اسی شہر میں ان کی وسعت علم اور حیرت انگیز ذہانت کے اعتراف کے طور پر ان کو بدیع الزمان (اور دوسرا لقب ...) کا لقب دیا گیا۔

قرآن کے بارے میں برطانیہ کے ایک وزیر کا اظہار خیال

انھیں ایام میں بدیع الزمان سعید نورسی نے مقامی اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ برطانیہ کے وزیر نو آبادیات گلیڈ اسٹون نے پارلیمنٹ میں قرآن ہاتھ میں لے کر کہا کہ جب تک یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے ہم ان پر حکومت نہیں چلا سکتے۔ ہمارے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم اس کتاب کو دنیا سے غائب کردیں یا مسلمانوں کا تعلق اس سے توڑ دیں۔

یہ خبر پڑھ کر نورسی سخت اضطراب میں مبتلا ہوگئے اور ان کی نیند حرام ہوگئی، انھوں نے سوچا کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی قائم کرنا ضروری ہے جو ایک طرف اسلام کے حقائق اور اس کے علوم کی نشر و اشاعت کرے اور دوسری طرف مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دے کہ وہ علم کے میدان میں آگے بڑھیں اور اپنی مادی و روحانی زندگی کو مستحکم بنائیں۔ یہ تجویز لے کر وہ ۱۸۹۶ء میں استنبول گئے لیکن وہاں کے ذمہ داروں نے ان کی تجویز کو بہرے کانوں سے سنا آخر وہ ناکام ہو کر اپنی جگہ واپس آ گئے۔

استنبول کا دوسرا سفر اس دوسرے سفر تک ان کی علمی شہرت دور سے ملک میں پہنچ چکی تھی اور استنبول میں ان کا علمی شہرت سے گھر گھر چرچا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ دوسری بار استنبول گئے تو اس

مرتبہ طلبہ اور علماء سے دوچار ہوئے۔ انہوں نے ان کا استقبال کیا۔ طلبہ نے بھی اور علماء نے بھی ان سے سوالات کئے اور انھوں نے ہر مسائل کا پوری وسعت علمی کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے نتیجے میں تمام لوگوں نے ان کی علمی امامت کا اعتراف کیا اور کہا کہ اس علم وفضل کا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔ ترکی کے عالم سید حسن تہجی پاشا اوخلو نے اپنی یادداشت میں ان سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔

"استنبول میں جب ایک جوان آیا جن کو بدیع الزماں کہا جاتا تھا تو اس وقت میں مدرسۃ الفاتح میں طالب علم تھا۔ میں نے سنا کہ انھوں نے اپنے بالاخانے کے دروازے پر یہ لکھ کر لگا دیا ہے کہ یہاں ہر مشکل حل ہوتی ہے اور ہر سوال کا جواب دیا جاتا ہے اور جواب دینے والا خود کسی سے کوئی سوال نہیں کرتا۔ یہ سن کر مجھے خیال آیا کہ اس طرح کا دعویٰ کرنے والا مجنون ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن تمام طلبہ اور علماء جو ان سے مل کر آئے وہ ان کی تعریف و تحسین کرتے۔ اس چیز نے میرے دل میں بھی ان سے ملنے کی رغبت پیدا کی۔ اس وقت استنبول میں مجھے سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ میں نے کچھ مشکل ترین اور دقیق ترین سوالات منتخب کئے، اور یہ سوالات "الٰہیات" یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں تھے۔

اس تیاری کے بعد میں ان سے ملنے گیا اور وہ تمام سوالات ان کے سامنے رکھے۔ انھوں نے ان سوالات کے جوابات دیئے وہ بڑے عجیب اور حیران کن تھے جیسے وہ اس وقت میرے ساتھ تھے جب میں وہ سوالات منتخب کر رہا تھا اور وہ کتابیں ان کے سامنے تھیں جن سے میں نے وہ سوالات منتخب کئے تھے۔ میں بالکل مطمئن ہو گیا کہ ان کا علم عام طرح کسی نہیں ہے بلکہ علم لدنی ہے۔

استنبول میں انھوں نے سلطان عبدالحمید سے بھی ملاقات کی اور ان کے سامنے یہ ضرورت پیش کی کہ اسلامی علوم کے مدارس کے ساتھ جدید علوم کے مدرسے بھی قائم کئے جائیں اور یہ بات انھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنی جرأت سے کہی اور سلطان سے اس انداز میں گفتگو کی کہ درباریوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کو طبیبوں کے پاس بھیجا گیا کہ وہ انھیں جانچ کر بتائیں کہ یہ پاگل تو نہیں ہے۔ امراض دماغی کے طبیب نے جواب دیا کہ اگر ان کے دماغ میں جنون کا ایک ذرہ بھی ہو تو دنیا میں کوئی ایک شخص بھی صحیح الدماغ نہیں ہے۔ مطلب یہ تھا

کہ ان میں جنون کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو وزارت داخلہ بھیجا گیا اور وزیر داخلہ سے یہ مکالمہ ہوا۔

وزیر:- سلطان نے خاص طور سے آپ کو سلام کہا ہے اور ایک ہزار قرش آپ کا وظیفہ مقرر کیا ہے اور جب آپ اپنے شہر واپس جائیں گے تو آپ کو تیس لیرا (ترکی سکہ) وظیفہ ملتا رہے گا۔ اور بطور ہدیہ یہ سی لیرہ سلطان نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔

بدیع الزماں:- میں کسی سرکاری عہدے یا وظیفہ کا خواہشمند نہیں ہوں اور اگر ایک ہزار لیرہ بھی ہو تو میں ہرگز قبول نہ کروں گا اس لئے کہ میں یہاں کسی تجارت اور ذاتی غرض سے نہیں آیا ہوں بلکہ مملکت کی مصلحت کے پیش نظر آیا ہوں۔ آپ لوگ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ دراصل اس بات کی رشوت ہے کہ میں خاموش ہو جاؤں۔

وزیر:- اس طرح تم ارادۂ سلطانی کو رد کر رہے ہو اور بادشاہ کا ارادہ رد نہیں کیا جاتا۔

بدیع الزماں:- میں اسی لئے رد کر رہا ہوں کہ سلطان کو یہ بات بری لگے اور وہ مجھے بلائیں تاکہ میں ان کے سامنے حق گوئی کا فریضہ انجام دے سکوں۔

وزیر:- سوچ لو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

بدیع الزماں:- بہانے مختلف ہیں اور موت ایک ہے۔ اگر میں قتل کر دیا گیا تو قلب امت میں مرا مرقد ہوگا۔ میں جب استنبول کے لئے روانہ ہوا تھا تو میں نے اپنی جان اپنی ہتھیلی پر رکھ لی تھی۔ تمہارا جو جی چاہے کر ڈالو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے انجام سے واقف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں امت کو بیدار کروں اور یہ اس لئے کہ میں اس ملک کا شہری ہوں اور اس کا ایک فرد ہوں۔ یہ کام میں نے اس لئے شروع نہیں کیا ہے کہ کوئی عہدہ حاصل کروں۔ میرے جیسا آدمی حکومت کی خدمت اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ حکومت کو نصیحتیں کرے۔ اور یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب النصیحت بے اثر ہوں اور تاثیر اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب نصیحت ذاتی مفاد کی آلائش سے پاک ہو اس لئے میں کوئی عہدہ اور وظیفہ رد کرنے کیلئے مجبور ہوں۔

وزیر:- اپنے شہر میں آپ جن علوم کی نشر و اشاعت کرنا چاہتے ہیں مجلس وزراء میں اس پر بحث آ چکی ہے۔

بدیع الزماں:- پھر اس تجویز کو کیوں ملتوی کر دیا جاتا ہے اور میرے لئے عہدے کی پیشکش جلدی کیوں کی جاتی ہے۔ کیا آپ لوگ شخصی مفاد کو ملی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ وزیر کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

اس کے بعد بدیع الزمان کی دعوت اسلامی اور تیز ہو گئی۔ وہ اپنی کتابوں میں اخبارات و رسائل میں مجلس شوریٰ اور نفاذ شریعت کی دعوت پوری صراحت کے ساتھ دیتے گئے۔

جمعیۃ اتحاد و ترقی کا پھندا

بدیع الزمان کی شہرت اور عوام پر ان کے اثر کی وجہ سے ماسونی جمعیۃ اتحاد و ترقی نے ان کو اپنے پھندے میں پھانسنا چاہا۔ "سلانیک" میں جمعیۃ اتحاد و ترقی کے صدر مشہور یہودی "عمانوئیل قرہ صو" نے بدیع الزمان سے ملاقات کی اور تھوڑی دیر کی گفتگو میں وہ بھاگ کھڑا ہوا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ اس شخص کی گفتگو نے مجھے اسلام کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے میں نے گفتگو بند کر دی۔

گرفتاری

جمعیت اتحاد و ترقی کے الحاد کی تردید بدیع الزمان نے جمعیۃ محمدی کے نام سے شروع کی وہ گرفتار کرکے فوجی محکمہ میں لائے گئے، انھوں نے اس قدر جرأت مندانہ صریح اور بلیغ انداز میں اپنے موقف کا دفاع کیا کہ رئیس محکمہ تک متاثر ہو گیا اور ان کو بری کر دیا۔ انھوں نے جو تقریر کی تھی اس کا اقتباس یہ ہے:

"اگر میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو میں حقائق اسلام میں سے کسی ایک حقیقت پر انھیں قربان کر دینے میں نہ جھجکتا، میں کہتا ہوں کہ میں ایک طالب العلم ہوں اور ہر چیز کو شریعت کی ترازو میں تولتا ہوں، میں صرف ملت اسلام پر یقین رکھتا ہوں۔ میں تم سے کہتا ہوں اور میں اس برزخ کے سامنے کھڑا ہوں جس کو تم قید خانہ کہتے ہو، مجھے اس ٹرین کا انتظار ہے جو مجھے آخرت تک پہنچا دے، میں یہ بات اس لئے کہتا ہوں کہ یہ پوری دنیا میں گونجے (نورسی جب محکمہ میں داخل ہوتے تھے تو اشارہ کر کے ان کو ان لوگوں کی لاشیں دکھائی گئی تھیں جن کو پھانسی دی جا چکی تھی یہ کام نورسی کو مرعوب اور خوفزدہ کرنے کے لئے کیا گیا تھا) انھوں نے کہا میں تو آخرت کا مشتاق ہوں اور ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں جو پھانسی پر لٹکا دیے گئے ہیں۔ پہلے کی مستبد حکومت عقل کی دشمن تھی اور اب یہ زندگی کی دشمن ہے، جنون زندہ باد، موت زندہ باد اور ظالموں کے لئے جہنم زندہ باد۔"

گلو خلاصی کے بعد "وان" واپس آئے اور وہاں کے خاندانوں اور قبیلوں میں وعظ و درس کا سلسلہ شروع کیا اور ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "مناظرات" رکھی۔

شام کا سفر

۱۹۱۱ء میں انھوں نے بلاد شام کا سفر کیا اور جامع اموی میں ایک بلیغ عربی خطبہ دیا مسلمانوں

کو انھوں نے جوش جہادی، حرکت اور اسلام کی ڈوری کو پوری مضبوطی کے ساتھ تھام لینے کی دعوت دی۔ یہ تقریر "خطبہ شامیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔

جہاد میں شرکت اور گرفتاری

بلقان کی جنگ عظیم اول میں سعید نورسی رضاکار فوج کے قائد متعین کئے گئے تھے "تبلیس" میں جب روسی فوجیں داخل ہوئیں تو ان کے مدمقابل طلبہ اور دوسرے رضاکاروں نے ان کی قیادت میں روسی فوجوں سے دست بدست جنگ کی۔ بدیع الزمان زخمی ہوئے اور انھیں گرفتار کرکے مشرقی روس بھیج دیا گیا قید خانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ان کی موت تک پہنچا سکتا تھا اس کی تفصیل یہ ہے:

مشرقی روس کی فوجوں کا سربراہ "اعلیٰ قیصر کا ماموں" نیکولا نیکولا نیچ" تھا وہ قیدیوں کو دیکھنے قید خانہ میں آیا کرتا، وہ آتا تو تمام قیدی اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے لیکن بدیع الزمان بیٹھے رہتے۔ یہ بات سپہ سالار نے نوٹ کی۔ وہ دوسری دفعہ ان کے سامنے سے گزرا لیکن یہ کھڑے نہیں ہوئے۔ جب تیسری بار بھی یہ کھڑے نہیں ہوئے تو وہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو ترجمان کے واسطے سے ہوئی۔ نیکولا نے پوچھا شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں، سعید نورسی نے جواب دیا، میں نے آپ کو پہچانا، آپ نیکولا نیکولا نیچ، قیصر کے ماموں اور محاذ قفقاز کے سالار اعلیٰ ہیں۔ اس نے کہا جب یہ بات ہے تو تم نے میری توہین کیوں کی؟ نورسی نے کہا ہرگز نہیں، میں نے کسی کی توہین نہیں بلکہ وہ کیا جو میرا عقیدہ مجھے حکم دیتا ہے، اس نے کہا تمہارا عقیدہ تمہیں کیا حکم دیتا ہے؟ سعید نے جواب دیا، میں ایک علم رکھنے والا مسلمان ہوں اور میرے قلب میں ایمان ہے، جس کے قلب میں ایمان ہوتا ہے وہ اس سے افضل ہے جس کے قلب میں ایمان نہیں ہے۔ اگر میں آپ کے لئے کھڑا ہوتا تو اپنے عقیدے کی توہین کرتا، اس لئے میں کھڑا نہیں ہوا۔ یہ سن کر اس نے کہا تم نے مجھے بے ایمان کہہ کر میری توہین کی بلکہ میری پوری فوج اور قیصر کی توہین کی ہے۔ اس لئے اس معاملے پر غور اور فیصلے کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی جائے گی، چنانچہ یہ عدالت قائم ہوئی اور اس میں سعید نورسی کا مقدمہ پیش ہوا۔ قید خانے کے تمام قیدیوں نے بدیع الزمان سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ وہ سالار اعلیٰ سے معافی مانگ لیں اور وہ جب آئے تو کھڑے ہو جائیں، انھوں نے انکار کیا اور کہا:

"میں آخرت کا مشتاق ہوں اور اس بات کا مشتاق ہوں کہ مر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں اس لئے میں اپنے ایمان کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

فوجی عدالت نے نورسی کی موت کا فیصلہ دیا۔ جس دن انھیں پھانسی دینی تھی اس دن چند فوجی انھیں لینے کے لئے آئے اور ایک افسر ان کے ساتھ آئے۔ اور سعید نورسی مسرت اور ابتہاج کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور دوسرے افسر سے کہا مجھے امید ہے کہ آپ مجھے آخری فریضہ انجام دینے کی مہلت دیں گے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں وضو کروں اور دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ انھوں نے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سالار اعلیٰ یہ پورا منظر ایک ٹیلے پر سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹیلے سے اتر کر نورسی کے قریب آیا اور وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا مجھے امید ہے کہ میری معذرت قبول کریں گے۔ مجھے گمان تھا کہ آپ کا میرے لئے کھڑا نہ ہونا میری اہانت کے لئے تھا لیکن اب مجھے یقین آگیا ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ آپ کے عقیدے اور ایمان کا حکم تھا۔ اس لئے میں نے فوجی عدالت کا حکم منسوخ کر دیا اور میں آپ کو آپ کی صلابت دینی پر مبارکباد دیتا ہوں اور دوبارہ آپ سے معذرت طلب کرتا ہوں۔ پھانسی کا قصہ تو ختم ہوا لیکن قید باقی رہی۔

سعید نورسی تقریباً ڈھائی سال تک جیل میں رہے۔ اس کے بعد جب زار شاہی کے خلاف روس میں بغاوت ہوئی تو حیرت انگیز طور پر ان کو جیل سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔ جیل سے نکل کر وہ جرمنی ہوتے ہوئے استنبول پہنچ گئے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ "دار الحکمۃ الاسلامیہ" کے رکن مقرر کئے گئے۔ بڑے بڑے علماء دار الحکمۃ کے رکن مقرر کئے جاتے تھے۔ ان کے رکن مقرر کئے جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ علوم جدیدہ کے بھی عالم تھے۔ حکومت نے اس کے لئے ایک بڑی تنخواہ یا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ نورسی بقدر ضرورت اسے اپنی ذات پر خرچ کرتے اور باقی تمام اپنی کتابوں کی طباعت پر صرف کرتے اور وہ کتابیں لوگوں میں مفت تقسیم کرتے۔

جب سامراجی حکومتوں کی فوجیں استنبول میں داخل ہو گئیں تو اس مصیبت کو نورسی نے عالم اسلامی کے لئے نیزے کی ضرب قرار دیا۔ اور اس کے خلاف جد و جہد کے لئے انھوں نے کمر کس لی۔ انھوں نے پمفلٹ تصنیف کرنے شروع کئے جن میں انگریزوں اور دوسرے حملہ آوروں کے خلاف عوام کو ابھارتے، ان سے جہاد کرنے کی دعوت دیتے اور دوسری طرف عوام میں حوصلہ پیدا کرتے، انھیں مایوس ہونے سے بچاتے وہ پمفلٹ ان کے دوستوں اور طلبہ کے ذریعے پوشیدہ طور پر لوگوں میں تقسیم کئے جاتے۔ اسی طرح سے جب غاصبوں کے خلاف جد و جہد شروع ہوئی تو انھوں نے ایک سو بارہ مفتیوں اور عالموں کا فتویٰ اس کی تائید میں شائع کیا۔ ان کی شہرت اور اعدائے اسلام کے خلاف ان کے جہاد کی وجہ سے انقرہ کی حکومت نے متعدد بار انقرہ آنے کی دعوت دی۔ وہ ۱۹۲۲ء میں انقرہ گئے اور اسٹیشن پر حکومت کی طرف سے ان کا شاندار

استقبال کیا گیا لیکن جلد ہی بدیع الزمان کو معلوم ہو گیا کہ حکومت انقرہ کے ارکان، اسلام اور اسکے فرائض و واجبات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ وہ ترکی کو اسلام سے دور ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے داعی اسلام کو جو صدمہ پہنچا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ انھوں نے انقرہ کی پارلیمنٹ میں ایک موثر تقریر کی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ پارلیمنٹ کے ۶۰ ممبر نماز پڑھنے کے لئے باہر آ گئے۔ اس چیز نے مصطفیٰ کمال کو بہت پریشان کیا۔ سعید نورسی اور اس کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس نے نورسی سے کہا۔

"بے شک ہمیں آپ جیسے عالم کی ضرورت ہے۔ ہم نے آپ کو یہاں اس لئے بلایا تھا کہ آپ کی اہم رایوں سے استفادہ کریں لیکن آپ نے سب سے پہلا کام ہمارے لئے یہ کیا کہ نماز کی باتیں شروع کر دیں۔ آپ کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ اس مجلس کے ارکان میں تفرقہ ڈال دیں۔"

سعید نورسی نے مصطفیٰ کمال کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پُرجوش لہجہ میں کہا۔

"اے پاشا! اے پاشا! ایمان کے بعد سب سے بڑی حقیقت جو ثابت ہو چکی ہے وہ نماز ہے، اور جو شخص نماز نہیں پڑھتا وہ خائن ہے اور خائن کا حکم مردود ہے۔"

اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے یہ طے کیا کہ نورسی کو واعظ عام بنا کر اطراف بھیجدے لیکن سعید نورسی نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ انقرہ ہی میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کے وجود اور اسلامی عقائد کے استحکام پر کتابیں لکھیں تاکہ اس انحراف کا مقابلہ کیا جا سکے جو خطرہ کی لاوے سے مسلم معاشرے میں داخل ہو رہا تھا۔ انقرہ میں آٹھ ماہ قیام کے بعد وہ "وان" آ گئے۔ وہاں وہ غیر آباد مقامات اور پہاڑوں پر عبادت اور غور و فکر کرتے رہے لیکن اس حال میں بھی حکومت نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان کو آزاد چھوڑے رکھے۔ چنانچہ وہ گرفتار کر کے استنبول لائے گئے اور وہاں سے ایک دور دراز گاؤں "بارلا" میں نظر قید کر دیئے گئے۔ یہ گاؤں ایک پہاڑ پر آباد تھا۔ اس وقت کے حکام نے یہ سمجھا کہ اس طرح الحاد کے خلاف اس تحریک کو وہ بے اثر کر دیں گے جو بدیع الزمان سعید نورسی کی قیادت میں چل رہی تھی لیکن وہ غلطی پر تھے۔ ترکی کا یہ دور دراز علاقہ سعید نورسی کے نور سے جگمگا اٹھا اور دعوت اسلامی کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔ اسی قید خانے

جن انھوں نے اپنی عظیم کتابیں لکھیں ان میں اسلامی حقائق پیش کیے گئے، الحادی اور تشکیکی لہروں اور موجوں پر بند باندھے گئے۔ اور مسلمانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے اسلام کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی کتابیں، رسالے اور پمفلٹ حیرت انگیز طریقے سے ترکی کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیل گئے۔ مردوں اور عورتوں نے ان کے ہاتھوں سے نقل کیے، اور پورے ملک میں پھیلا دیے۔ ان کتابچوں نے ایک طرف ترکی عوام کو ایمان و اسلام کی حقیقت بتائی اور دوسری طرف ان پر یہ واضح کیا کہ اسلام کے بارے میں اتاترک کی حکومت کا منصوبہ کیا ہے۔ پورے ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی آخر کار مصطفیٰ اتاترک کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

سعید نورسی کی دوبارہ گرفتاری اور عدالت میں انکا ایمان افروز بیان

۱۹۳۲ء میں حکم صادر ہوا کہ عربی زبان میں اذان نہ دی جائے۔ سعید نورسی نے یہ حکم نہیں مانا، اور ان کے شاگردوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ مسجد کے اندر عربی زبان میں اذان دیتے تھے جب یہ بات حکومت کو معلوم ہوگئی تو اس نے نورسی کو اسپارٹا بھیج دیا وہ چند مہینے رسائل نور کی تصنیف کرتے رہے ۱۹۳۴ء کی ایک صبح کو بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔ ان میں سعید نورسی بھی تھے وہ ایک فوجی عدالت میں پیش کیے گئے اور گیارہ ماہ کی ان کو سزا دی گئی جرم یہ بتایا گیا کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں جنمیں عورتوں کو یہ دعوت دی گئی کہ وہ بے پردہ باہر نہ نکلیں بلکہ چادر یا برقع اوڑھ کر نکلیں۔ اپنے دفاع میں حاکم عدالت کے سامنے جو تقریر انھوں نے کی وہ ان کی مشہور تقریر ہے، ان کے چند اقتباسات یہ ہیں:-

"مجھے اس تہمت میں یہاں لایا گیا ہے کہ میں ایک رجعت پسند شخص ہوں اور مذہب کا پروپیگنڈا کرتا ہوں جس سے امن عام میں خلل واقع ہو سکتا ہے، میں تم سے کہتا ہوں کہ کسی عمل کا ممکن ہونا اور چیز ہے اور اس کا واقع ہو جانا اور چیز ہے۔ محض امکان پر عتاب نازل کرنا اور سزا دینا صحیح نہیں ہے۔ دیکھو! جس سے ممکن ہے کہ کسی کا گھر جلا دیا جائے، اب اگر کسی کے پاس ماچس ہو تو کیا یہ امکان اس کو مرتکب جرم قرار دیگا؟ میں جو علوم اسلامی میں مشغول ہوں تو اس کا محرک اللہ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں ہے

"تمہارے لیے یہ کہا گیا ہے کہ میں صوفیہ کے طریقوں میں مشغول ہوں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ ہمارا یہ زمانہ ایمان کی حفاظت کا زمانہ ہے، طریقت کی حفاظت کا زمانہ نہیں ہے بہت سے لوگ جنت میں اس کے بغیر داخل ہوں گے کہ وہ صوفیہ کے کسی طریقے سے تعلق رکھتے تھے یا نہیں لیکن کوئی شخص جنت میں ایمان کے بغیر داخل نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ اتنا مال کہاں سے آتا ہے کہ تو اپنے ارد گرد ایک جماعت کی شکل میں لوگوں کو جمع رکھتا ہے۔ اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ تمہارے پاس وہ کونسے وثائق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے کوئی جماعت بنائی ہے یا میں ایسے کام کر رہا ہوں جس کے لیے مال کی ضرورت ہے؟"

اک گردش ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

"اس شہر کی جیل میں سعید نورسی رہ گئے، وہ [illegible] اس کے بعد ۱۹۴۹ء [illegible] منظوری میں جلا وطن کر دیا گیا، پولیس [illegible] ایک مکان میں [illegible] وہ سات سال تک وہ نظر بند رہے، اس مدت میں وہ [illegible] سال اور [illegible] ترکی کے ہر گوشے میں پہنچتے رہے اور ان رسالوں کا یہ پھیلاؤ حکومت کو پریشان کرتا رہا۔ سعید نورسی کی زندگی کا بڑا حصہ اس مقام سے اس مقام، اس جیل سے اس جیل میں گزرا۔ گویا ایک گردش ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔ ہر سزائے قید کے وقت انھوں نے عدالتوں میں جو بیانات دیئے وہ حوصلہ، بے خوفی و جرات ایمانی کے چراغ ہیں جو ترکی میں اسلام کی روشنی پھیلاتے رہے۔ اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔ ڈینزلی کی عدالت میں جو بیانات انھوں نے دیئے ہیں وہ تمام بیانات سے زیادہ جرات مندانہ ہیں۔

سعید نورسی پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ایک خفیہ دینی جماعت بنائی ہے جو موجودہ لادینی حکومت کو ختم کرنے کے لئے عوام کو ابھارتی ہے۔ اس کے جواب میں سعید نورسی نے کہا:-

"ہاں ہم ایک جماعت ہی ہیں، یہ جماعت ہر زمانے میں چالیس کروڑ افراد پر مشتمل رہی ہے اس جماعت کا جو عظیم الشان دستور ہے اس کے تحت یہ ہر روز پانچ بار اپنے ارکان کو ایمان [illegible] تعلق کو [illegible] جانے رہنے کا کام کرتی ہے تاکہ ان کا سب سے اہم شعار

باقی اور برسرکار رہے، یہ شعار ہے انما المومنون اخوۃ (بلاشبہ مومن بھائی بھائی
ہیں)، ہم اسی مقدس اور عظیم جماعت کے افراد ہیں۔ ہماری ڈیوٹی یہ ہے کہ ان مسلمان
بھائیوں کو علمی انداز میں قرآن کے حقائق بتائیں اور انھیں مضبوط بنائیں۔ اور یہ دراصل
ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہے۔ اس ابدی قید خانے سے اپنے آپ کو آزاد کرنے
کے لئے جو ہر وقت ہمیں دھمکا رہا ہے۔

الزام کا یہ جواب کتنا گہرا، کتنا عمدہ اور کتنا ایمان افروز ہے، انھوں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا:۔

"تم رسائل نور کی حرکت کو کیسے روک سکتے ہو، اس لئے کہ وہ حقائق قرآن کی خدمت ہے اور
قرآن وہ حقیقت ہے جس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم سے جڑا ہوا ہے اور کس کی مجال
ہے کہ وہ اس رشتے کو کاٹ سکے جو عرش عظیم سے جڑا ہوا ہے۔

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر خفیہ سیاست و جمعیت کا اتہام کس طرح لگ سکتا
ہے جو بامر قرآن کی حجت اس کے معجزات اور اس کے نہایات کا تیار کرتے اپنے مرحب
کرو دوسری طرف دین سے خارج ڈاکٹر دوزی کو یہ حق حاصل ہے کہ قرآن اور ان کے
حقائق پر بے شرمی کے ساتھ بہتان باندھے اور پھر اسے ایک مقدس کام سمجھا جائے۔
اس لئے کہ یہ رائے اور فکر کی حریت ہے۔ کیا رائے و فکر کی آزادی اسی کا نام ہے؟
اور قرآن کا نور جو لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو روشن رکھتا ہے اس کو "خطرہ" قرار
دیا جائے اور جتنے گھناؤنے الفاظ ہو سکتے ہیں وہ سب ان کے لئے استعمال کئے جائیں،
اس معاملے میں فکر اور رائے کی حریت اور اس کا تقدس کہاں چلا جاتا ہے؟

تم لادینی جمہوریت کی بات کرتے ہو، کہا جاتا ہے کہ دین و مذہب سے اس کا تعلق نہیں
ہے نہ اچھا نہ برا، یعنی وہ غیر جانبدار ہوتی ہے لیکن تمھارا حال کیا ہے؟ تم نے ہر جرم
ہر اخلاقی گندگی یہاں تک کہ خدا پر جھوٹ اور افترا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اور یہ
تم رائے فکر اور ضمیر کی حریت کے نام پر کر رہے ہو، لیکن جب تمھارے سامنے قرآن کی
کسی آیت کی تفسیر و تشریح کی جاتی ہے تو تم چیخنے لگتے ہو، خفیہ جمعیت و سیاست، خطرہ!"
اس کے بعد سعید نورسی نے جس شدت اور جرأت کا مظاہرہ کیا اسے پڑھیے!:

اگر اسلام کی راہ ہے تو اچھی طرح جان لو کہ اگر میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو میں اللہ کے دین پر
ان سب کو قربان کرنے کے لئے بالکل تیار ہوتا۔ میں تمھارے شر سے صرف ایک قلعہ میں پناہ لیتا
ہوں اور وہ ہے حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔

پھر گھوم گھوم کر کہتے ہو کہ میرے اعمال، رسائل نقض امن اور امن عامہ میں خلل پیدا کرنے کا
ذریعہ ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تمھارا یہ دعویٰ نقض اندوزی ہے، اور تم
امن عامہ کا بہانا بنا کر دین اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہو، تم جانتے ہو کہ رسائل نور بیس سال سے
دور پھیلا رہا ہے تو اس طویل زمانے میں اس کی وجہ سے کوئی ایک واقعہ بھی امن عامہ کے
خلاف ہوا ہے؟ اور کیا تم اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟ ہاں تم کان کھول کر سن لو۔ اے وہ
لوگو جنھوں نے دنیا کے عوض اپنا دین بیچ ڈالا ہے، اور کفر مطلق نے تمھیں اندھا کر دیا ہے
میں تم سے کہتا ہوں اس ابدی قوت سے جو مجھے اللہ نے عطا کی ہے کہ تم جو کچھ کر سکتے
ہو کرو۔ ہماری انتہائی آرزو یہ ہے کہ اسلام کی جیت ہو اور ہم اسی حقیقت پر اپنا سر نچھاور
کر دیں۔

اپنی ذات، اپنی دعوت حق اور اسلام کی طرف سے جو دفاع انھوں نے کیا اس میں یہ بھی کہا:
"ہم ہزار دو جیل میں رہنے کو مزید ترجیح دیتے ہیں کہ اس استبدادی حکومت کے سائے میں
دھرتی کو چاک چاک ہوتا ہوا دیکھیں۔ اس ظالم حکومت میں کوئی آزادی باقی نہیں ہے۔
نہ علم کی آزادی، نہ ضمیر کی آزادی، نہ اظہار خیال کی آزادی اور نہ دین کی آزادی۔

زنادقہ اور منافقین نے تمھاری پشت پناہی سے دھوکا کھا کر عدل و دین کے گال
پر طمانچے مارے ہیں۔ انھوں نے استبداد کو جمہوریت، ارتداد کو نظام حکومت، جہل اور حماقت
کو تمدن اور ظلم کو قانون بنا ڈالا ہے اور اس طرح انھوں نے اپنے وطن سے غداری کی ہے
اور اسے ایسی ضرب لگائی ہے جو کوئی اجنبی بھی اسے نہیں لگا سکتا ہے۔

دفاع میں آخری حد تک جو بات وہ کہہ سکتے تھے وہ یہ تھی:
"خبردار، اچھی طرح جان لو کہ اگر جسم میں جتنے بال ہیں، اتنے سر ہوتے اور ہر دن ایک سر
میرے جسم سے کاٹا جاتا، تو بھی اس سر کو جو حقائق قرآنیہ کی نذر ہے زندیقوں کے آگے

کبھی نہ جھکایا۔

(ستاد لوری ۱۹۵۰ء تک اس حال میں رہے کہ کبھی جیل میں اور کبھی نظر بند پھر جب ملک میں آزادانہ انتخابات ہوئے اور ایسی پارٹی برسر اقتدار آئی جو ملحد و زندیق نہ تھی تو اسلام پر تحدد جو تمام حدود سے جاری تھا اس کی شدت کم ہوئی اور پہلی دفعہ اس کا موقع ملا کہ رسائل نور کو طباعت نصیب ہوئی اور سعید نورسی کو بھی ملک میں چلنے پھرنے کی آزادی ملی۔

وفات بدیع الزماں سعید نورسی آخر وقت تک اپنے کاموں میں سرگرم اور جیتے رہے یہاں تک کہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو وہ اپنے رب سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ترکہ بدیع الزماں سعید نورسی رحمۃ اللہ نے اپنے ترکے میں کتابیں چھوڑیں۔ وہ رسائل نور کی تصنیفات سے مشہور ہوئے ان رسائل کا اصل موضوع اسلامی عقائد و اعمال ہیں خواہ وہ کلی ہوں یا جزئی۔ ان کی قوت حافظہ وسعت مطالعہ اور خارق عادت ذہانت کا ذکر ان کے حالات میں ہو چکا ہے۔ قرآن کریم ان کی زندگی کے لئے پانی تھا اور وہ اس کی مچھلی تھے۔ ان کے تمام رسائل میں وہی جذبات، وہی خیالات، وہی عقائد و نظریات پھیلے ہوئے ہیں جو انھوں نے قرآن سے حاصل کئے تھے۔ (ماخوذ)

ایڈز

جولائی ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتہ میں پیرس میں ماہرین طب کی ایک کانفرنس ہوئی اس کا مقصد ایڈز کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر ایڈز کے جراثیم امریکہ کی طرح بقیہ دنیا میں پھیلے ہیں تو ۱۹۹۱ء میں تین لاکھ مزید ایڈز کے مریض پیدا ہو چکے ہوں گے۔ ماہرین کی پیشین گوئی کے مطابق اس وقت امریکہ میں ۴۰ ہزار نئے افراد ایڈز کے مرض میں مبتلا ہوں گے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۹۱ء تک ایک ملین سے زیادہ امریکی باشندوں کو یہ بیماری لگ چکی ہوگی۔ اور ۱۶۹ ہزار افراد مر جائیں گے۔ امریکی اسپتالوں کا ایڈز کا بل اس وقت تک آٹھ بلین ڈالر ہو چکا ہوگا۔ اس وقت یورپی ملکوں میں فرانس سب سے زیادہ (۷۰۰) اس مرض سے متاثر ہوا ہے دوسرے نمبر پر مغربی جرمنی (۲۵۰) ہے تیسرے نمبر پر برطانیہ (۲۳۹) اور چوتھے نمبر پر اٹلی (۲۱۹)۔ (دی نائمز آف انڈیا (بمبئی) ۵ جولائی ۸۶ء بحوالہ خاتون اسلام صفحہ ۳۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

— ادارہ —

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ میں تعلیم کا آغاز

رمضان المبارک کی طویل تعطیل کے بعد ۸ جون ۱۹۸۶ء کو جامعہ میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا ہے دور دراز اور قرب وجوار کے تمام طلبۂ جامعہ آچکے ہیں اور تعلیم شروع ہو چکی ہے۔ نئے طلباء اور طالبات بھی ایک بڑی تعداد میں تشریف لائے ہیں۔ ڈیڑھ مہینہ کی خاموشی اور سناٹے کے بعد جامعہ میں ایک نئی چہل پہل شروع ہو گئی ہے اور سونے سونے گھر آنگن میں ایک طرح کی بہار آگئی ہے

کینٹین کا قیام

جون ۸۶ء کے اوائل میں مقامی انجمن طلبۂ قدیم جامعہ کی شوریٰ کی ایک مختصر نشست ایک شب میں ہوئی جس میں ... کیا گیا، اور اپنی سفارشات کے ساتھ صدر انجمن کے پاس منظوری کے لئے بھیج دیا گیا۔ اسی نشست میں ایک کینٹین کے قیام کا فیصلہ بھی کیا گیا جس کو انجمن ... کے تعاون سے ... اظہار صاحب فلاحی ندوی کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا۔ انشاء اللہ ... ہوگا کینٹین کا افتتاح ہو چکا ہوگا۔ اور طلباء اور اساتذہ اس سے استفادہ کر ...

جامعہ کے ایک استاذ کو انعام

انجمن حامیان اردو ضلع پرتاپ گڑھ (سابق گورنمنٹ ہائی اسکول ودی ضلع ایوت محل (مہاراشٹر) نے ۲۳ اپریل ۱۹۸۶ء کو جناب قاضی زین العابدین صاحب استاذ جامعۃ الفلاح کو آل انڈیا مضمون نگاری کے مقابلے کے سلسلہ میں ریسرچ فاؤنڈیشن کے تحت پہلا انعام مبلغ پانچ سو روپے دینے کا اعلان کیا ہے موصوف کے مقالہ کا عنوان "مسلم سلاطین ہند اور ان کا عہد حکومت" (قبل از مغلیہ دور) تھا۔ ادارہ موصوف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ایک فلاحی کے لئے دعائے مغفرت

بہار اسٹیٹ سے تعلق رکھنے والے برادر عزیز احمد فلاحی ابن حافظ محمد مستقیم صاحب رکن جماعت اسلامی گدی کا ۱۱ اپریل ۱۹۸۱ء کو مسلسل دو مہینے موت وحیات کی کشمکش کے بعد گاندھی نگر اسپتال رانچی میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم بڑے ہی نیک، اپنے ضعیف والدین کے اکلوتے بیٹے اور ۲۵ سال کے جوان سال کارکن تھے۔ عزیز احمد مرحوم فارغین کے تیسرے بیچ سے تعلق رکھتے تھے۔ Blood Uria کے شکار ہوکر گیرکے مرض میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ پسماندگان میں دو بچے، دو بچیاں، اہلیہ اور ضعیف والدین ہیں۔ قارئین سے عموماً اور فلاحی برادران سے خصوصاً دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ خدا ان کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگذر کرے اور جنت میں بہترین مقام عطا کرے۔ نیز ان کے والدین اور بچوں کو صبر جمیل عطا کرے

جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب

۲۵ جون بروز جمعرات پنج شنبہ بعد نماز عشاء جمعیۃ الطلبہ کے نئے ذمہ داروں کا انتخاب ہوا۔ مولانا عمران صاحب ومولانا مطیع اللہ صاحب کی نگرانی میں یہ انتخاب عمل میں آیا۔ نئے ذمہ داروں کے نام یہ ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ انھیں اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین

عبید الرحمن سکریٹری۔ محمد سعید نیپالی لائبریرین۔ شمشاد عالم معتمد عربی خطابت عطاء الرحمان معتمد انگریزی خطابت۔ ابو الکلام آزاد اعظمی معتمد اردو خطابت پنجم تا ہفتم۔ یٰسین پٹیل معتمد اردو خطابت سوم تا چہارم۔ قاضی محمد نفیس معتمد اردو خطابت اول تا دوم۔ فیروز عالم نیپالی رسائل وجرائد انچارج۔ رضوان الحق اسٹور انچارج۔ سعید محمد عامر گیم انچارج۔ محمد رضوان خدمت خلق۔ صفائی انچارج اخلاق احمد اعظمی۔ باغبانی آفتاب رحمانی

عبد العظیم فلاحی کو صدمہ

برادر عزیز جناب عبد العظیم فلاحی کے والد محترم جناب محمد ایوب صاحب کا اپنے وطن چاندپٹی میں ۴ جون کو ساڑھے گیارہ بجے شب میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم مولانا نظام الدین صاحب امیر حلقہ گجرات کے سگے بھائی تھے۔ خدا ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے اور رحمت ومغفرت کا معاملہ کرے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ●